بے نام موسموں کا نوحہ

عوض سعید

بے نام موسموں کا نوحہ

عوض سعید

سنہ اشاعت: اگست ۱۹۸۷ء

پہلا ایڈیشن: پانچ سو

سرِورق: سعادت علی خاں

کتابت: محمد منظور احمد

ابتدائی صفحات و عنوانات: محمود سلیم

طباعت سرِورق: ڈالفن پریس، باغ عام روڈ نامپلی حیدرآباد۔

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد۔

ناشر: مصنف

معاونت: اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش

قیمت: تیس روپے -/Rs. 30

تقسیم کار:

- مکتبہ شعر و حکمت 11-6-865 ریڈ ہلز حیدرآباد
- الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد
- حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان۔ حیدرآباد
- موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ دریا گنج نئی دہلی ۲
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔ بمبئی۔ علی گڑھ
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں دہلی۔
- ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ
- مصنف 11-6-865/2 لکڑی کا پل۔ حیدرآباد

فہرست

شاذؔ مرحوم کے نام...

کوما

روز کی طرح آج بھی رات کے تابوت میں وہی سب کچھ تھا لیکن یہ صبح ــ؟
یہ تو رات سے بھی زیادہ ظالم، کٹھور، بھیانک اور بدصورت ہے۔
معبودا! کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ رات گزرنے کے بعد لوٹ کر نہ آئے اور صبح کی سپیدی اپنا مُنہ چھپائے کہیں اور چلی جائے دور جنگل اور بیابانوں میں تاکہ وہ اپنے چہرے کے نقوش اُجالے کے سامنے بے نقاب نہ کر سکے۔
وہ کرسی پر اس طرح لاتعلقی سے بیٹھا تھا جیسے بیمار کی ذات سے اُسے ذرا بھی دلچسپی نہ ہو۔ پھر وہ ہسپتال کیوں آیا تھا۔ کس نے اُسے یہاں آنے پر مجبور کیا تھا۔ ایسے کئی سوال اُس کے ذہن میں اُبھر رہے تھے جنھیں وہ ذرا سی بھی اہمیت دینا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ وہ انجانا سا غم جس کی گرفت میں وہ جکڑا ہوا تھا خود اُس کے لیے ایک سوال تھا اور جب سوال ایک چیلنج بن جائے تو جواب کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔
آج تنہائی کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ وسوسے، اُلجھنیں، دوری، قرب، زندگی، موت، اچھائی برائی، کچھ پانے اور کھونے کی خواہش اور خواہش کی مزار پہ کُنڈلی مارے بیٹھا ہوا کالا ناگ۔ کوما ــ کوما۔ کتنا زہر بھرا ہے اس لفظ میں ــ شاید اسی منزل پہ پہنچ کر آدمی کا دماغ شعوری سطح پر بالکل ماؤف ہوجاتا ہے۔

وہ اب اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس انتظار میں کہ اس کے منجمد ہونٹ ذرا بھی حرکت میں آئیں تو وہ اُسے یاد دلا سکے کہ وہ ....

نہیں نہیں، وہ تو اب ڈاکٹروں اور نرسوں کے درمیان اپنے بیڈ پہ آخری سانس لے رہا ہے۔

"ڈاکٹر ۔۔۔۔۔؟"

"شاید بچ جائے؟"

"ڈاکٹر "

"ابھی کچھ اُمید باقی ہے۔ کیوں کہ اس کے منجمد ہونٹ کبھی کبھار ...."

"ہاں میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے۔ جیسے وہ آخری بار کچھ کہنے کے لیے تڑپ رہا ہو۔ اُس کے ہونٹوں کی طرح اس کے گھر پر بھی مدت سے تالا پڑا تھا۔ اُس کے گھر کی چابی کہیں گُم ہو چکی تھی۔ شاید در و دیوار پر مکڑیوں نے جالے بکھیر دیئے ہوں۔ پرندوں نے اپنا گھر بنا لیا ہو۔

موت۔

چابی۔

تالا اور بند گھر

"ممکن ہے بچ جائے؟ شاید نہ بچے۔"

کبھی وہ روز اس کے گھر آیا کرتا تھا۔ لمبی لمبی گپیں ہانکنے، ہنسنے ہنسانے اور کبھی کبھار ڈرامائی انداز میں آنسو بہانے کے لیے جیسے وہ اسٹیج کا ایک منجھا ہوا ایکٹر ہو۔

"بھابی مجھے آپ کے ہاتھ کی چائے بہت پسند آتی ہے۔ مجھے تو دھکی میں بھی وہ مزا نہیں آتا جو آپ کے ہاتھ کی چائے پینے میں آتا ہے۔"

"گپ باز کہیں کا"

وہ پرانا دیوہیکل ہسپتال شہر کی اس اہم سڑک سے کچھ اس طرح جڑا ہوا تھا جیسے زندگی اور موت کے درمیان کوئی زیادہ فاصلہ نہ ہو۔

اس شاہراہ پر سے وہ روز اس طرح گزرتا تھا جیسے یہ راستہ۔ راستہ نہ ہو۔ کوئی پل صراط ہو۔

وہ یکبارگی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور آفس کی طرف چل پڑا۔ آفس سنسان تھا اور لوگ بھاگ جا چکے تھے۔ ایک چپراسی ہاتھ میں ایک فائل دبائے آفس کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔

"ذرا دیکھنا، میڈم کہیں سٹاف روم میں تو نہیں ہے؟"

نہیں صاحب اسٹاف روم بند ہے۔ جو یہاں تھے وہ سب جا چکے"۔

اس نے ذرا سا بھی انتظار نہ کیا۔ کم از کم آج تو اسے ٹھہرنا چاہیے تھا۔

"بھابی یہ میری طرف سے آپ کی سالگرہ پر تحفہ"۔

"انھیں تو میری سالگرہ کی تاریخ تک یاد نہیں رہتی"

"ماں تو اگر کسی دن میں اچانک مر جاؤں اس وقت تم کیا کروگے یہی نا کہ مجھے مٹی میں پھینک آنے کے چند ہی ماہ بعد اپنی تنہائی کا جواز تلاش کرلوگے"۔

"کیا تم بھی مجھے ان ہی لوگوں کی طرح سمجھتی ہو۔ جنھوں نے ......"

"میں جانتی ہوں تم آگے کیا کہنا چاہتے ہو مگر میں نہیں چاہتی کہ کوئی ہوا کے جھونکے کی طرح گھر میں داخل ہو اور اسی انداز سے لوٹ لی جائے"۔

ایک بھانڈ جب اپنا روپ بدلتا ہے تو کبھی کبھی ایک سنجیدہ آدمی کو بھی اس کی

جگہ لینی پڑتی ہے۔ لیکن میری نظر میں وہ دونوں مسخرے ہیں۔ کیا تم میرے اِس خیال سے متفق ہو۔؟"

"نہیں فرق صرف اِتنا ہے کہ کوئی مر کر بھی دفن نہیں ہوتا اور کوئی زندہ رہ کر آپ ہی آپ دفن ہو جاتا ہے"۔

آئندہ کیا ہوگا یہ میں نے کبھی نہیں سوچا۔ میں نے ہمیشہ آج کی چوکھٹ پر سجدہ کیا ہے۔ آنے والے کل سے مجھے ذرا بھی واسطہ نہیں۔ آج تم تنہا میرے ساتھ ہو۔ یہی سب سے بڑی حقیقت ہے"۔

وہ گھر کی دہلیز پر کھڑا ان گڈمڈ ہوتے ہوئے سایوں کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ ایک انجانا سا غم جس کی گرفت میں وہ جکڑا ہوا تھا خود اس کے لیے ایک سوال تھا اور جب سوال ایک چیلنج بن جائے تو جواب کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

اِس پُل صراط پر وہی نہیں اور لوگ بھی تھے جن کے چہروں پر کالی نقابیں پڑی ہوئی تھیں۔ مگر اس کا چہرہ بے نقاب تھا۔

"چہرے پر ماسک لگالو۔ ورنہ نیچے پاتال میں گر جاؤ گے"۔

پھر اچانک اس کے ہاتھ اپنے چہرے کی طرف اُٹھ گئے۔ اُسے احساس ہوا جیسے اس کا چہرہ بھی اور چہروں کی طرح نقاب سے ڈھکا ہوا ہے۔

"اب بھی وقت ہے چہرے پر ماسک لگالو"۔ پھر وہی آواز اُبھری۔

اسے یہ سب کچھ ایک خواب سا لگا۔

سہ پہر کی اُداسیاں شام کے سایوں میں آہستہ آہستہ ڈھل رہی تھیں۔ اور اس کے قدم ہسپتال کی جانب اس طرح بڑھ رہے تھے جیسے کسی نے اُس پر

سینچر کر دیا ہو۔

ہسپتال سے لگی ہوئی خاموش سڑک آج لوگوں کے ہجوم سے اٹی ہوئی تھی اور لوگ اپنے اپنے اعمال ناموں کا بوجھ اٹھائے ایک دوسرے کو دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

اُس کے پاس بھی اپنے اعمال نامے کی ایک کہنہ پٹاری تھی جس میں اس کے شب و روز کے حساب کی بجائے کسی اور کے شب و روز کا حساب کب کا جمع ہو چکا تھا۔

اب اس کے سامنے دواخانے کی کہنہ عمارت سر اونچا کئے کھڑی تھی۔ جہاں اُسے جانا تھا۔

وہ ہسپتال کے لان سے گزرتا ہوا سیڑھیوں سے لگی لفٹ کے قریب جب پہنچا تو اس کی نگاہیں اس تختی پر گئیں جہاں آج لفٹ OUT OF ORDER ہے کی اطلاع درج تھی۔

دواخانے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اُسے آج پھر ایک بار احساس ہو رہا تھا جیسے وہ پُل صراط پر چل رہا ہو۔

"۲۷ نمبر والا تو ابھی تک موت سے جنگ کر رہا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے اس کے قدم رک سے گئے۔

"جس شخص میں موت سے لڑنے کی اتنی ہمت ہو۔ وہ کسی نہ کسی طرح ہسپتال کی گھٹن سے باہر آہی جاتا ہے۔"

لو وہ ڈاکٹر بھی آگیا۔

شاید ۲۷ نمبر والا ــــــ ؟

اُس کے قدم پھر ایک بار رک گئے۔

"ڈاکٹر کیا وہ بچ جائے گا۔؟ میں نہیں چاہتا کہ وہ مزید زندہ رہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں ڈاکٹر۔"

کوئی مر کر بھی دفن نہیں ہوتا اور کوئی زندہ رہ کر آپ ہی آپ دفن ہو جاتا ہے۔

"مگر وہ ۲۷ نمبر والا تو کبھی کا ....؟"

اس کے قدم چلتے چلتے پھر ایک بار رک گئے۔

اب اس پل صراط پر وہی نہیں اور لوگ بھی تھے جن کے چہروں پر سیاہ نقابیں چڑھی ہوئی تھیں مگر اس کا چہرہ بے نقاب تھا۔

"چہرے پر ماسک لگالو۔ ورنہ اوندھے منھ گر پڑو گے۔"

اس نے نیم وا آنکھوں سے نیچے کی طرف دیکھا۔ ہسپتال سے لگی ہوئی خاموش سڑک آج لوگوں کے ہجوم سے اٹی ہوئی تھی اور لوگ اپنے اپنے اعمال ناموں کی پٹاریاں کھولے ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔

بے نام موسموں کا نوحہ

"آخر تم نے ظفر کی موت کی خبر اُسے سُنا دی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ وہ دِل کے عارضے میں مبتلا ہے۔"

"مرنے والا بھی تو دِل ہی کا مریض تھا۔"

"لگتا ہے جیسے اس قدرِ مشترک میں تم اپنی حماقت کا جواز تلاش کر رہے ہو۔ اگر اُسے کچھ ہو گیا تو ——؟"

"گھبراؤ نہیں وہ بڑا سخت جان ہے۔ اگر اُسے مرنا ہی ہوتا تو اسی وقت مر گیا ہوتا جب اس کی محبوبہ نے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سامنے دم توڑ دیا تھا۔ اِس دن بھی وہ ایسا ہی پر سکون تھا اور آج جب میں نے اُسے ظفر کی موت کی خبر سنائی تو جانتے ہو۔ مجھ سے اس نے کیا کہا۔

"یار ہمیشہ سگریٹ کا پیکٹ چھپائے رکھتے ہو۔"

اور جب میں نے سگریٹ کا پیکٹ اس کے سامنے رکھ دیا تو وہ بڑی شتابی سے سگریٹ پینے لگا۔

"بھلے مانس تم نے اُسے سگریٹ کیوں دی؟"

" وہ نہ مانگتا تب بھی میں اسے سگریٹ ضرور پیش کرتا۔"

" جانتے ہو ڈاکٹر نے اس کے بارے میں کیا کہا ہے ؟"

" جانتا ہوں یہی نا کہ تیسرا اٹیک اس کے لیے بڑا جان لیوا ثابت ہوگا۔"

" تم اسے آہستہ آہستہ موت کے کنویں کی طرف دھکیل رہے ہو۔"

" میں یا تم ؟"

" کیا کہہ رہے ہو ؟"

" سچ ہمیشہ کڑوا لگتا ہے۔ کیا کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ کسی پر رحم کھانے سے زیادہ بے رحمی اور کیا ہو سکتی ہے اور پھر اچانک منہ موڑ کر چلے جانے والا وہ ظفر ...."

بات مزید بڑھنے سے پہلے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

اب اس کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک راستہ تو اس قبرستان کی طرف تھا جہاں ظفر کو منوں مٹی کے نیچے پھینک آنے کی رسم میں اسے بھی شریک ہونا تھا۔

دوسرا راستہ کیا ہو سکتا تھا۔ وہ اس سے جیسے نا آشنا تھا۔

جب وہ قبرستان پہنچا تو سوائے اس کے عزیزوں اور چند پڑوسیوں کے کوئی اور نہ تھا۔

" بے چارے کو شراب لے ڈوبی۔ ورنہ بچ جاتا۔"

" کیا بک رہے ہو ؟"

" اگر تمھیں موت پر اتنا ہی یقین ہے تو قبرستان سے لگے ہوئے کنویں میں چھلانگ لگا کر دیکھ لو۔"

جنازہ ایک طرف دھرا تھا اور لوگ آپس میں الجھ رہے تھے۔

"قبر کب تک تیار ہو جائے گی بھائی۔" کسی نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ابھی ایک گھنٹہ شاید اور لگ جائے۔" گورکن نے پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کے قطروں کو اپنے میلے کچیلے رومال سے پونچھتے ہوئے کہا۔

ایک آدمی نے جواب تک قبر کے قریب چپ چاپ کھڑا تھا۔ آہستہ سے کہا۔ "بھائیو! یہ قبرستان ہے کیا عجب کہ آنے والے کل کے دن ہمیں بھی یہیں آنا پڑے لاشے کی صورت میں ——"

اب موت کے انجانے خوف سے قبرستان میں کھڑے ہوئے لگ بھگ سبھی لوگوں کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔

وہ ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ موت کے سرہانے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں۔

وہ کب قبرستان سے گھر لوٹا۔ غم غلط کرنے کے لیے اس نے نیند کی کتنی گولیاں کھائیں۔ اسے کچھ یاد نہ تھا۔ ہاں اتنا ضرور یاد تھا کہ اس کی بیوی اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ شاید کوئی اجنبی اس سے ملنے آیا ہے۔

اُس نے مُندی مُندی آنکھوں سے دروازہ کھولا اور بڑی بے دلی کے ساتھ اُسے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ وضع قطع سے کوئی ایسا معقول آدمی نہیں لگ رہا تھا جس سے کوئی ڈھنگ کی بات کی جا سکے۔

"میں معذرت خواہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ کے آرام میں خلل پڑا۔"

"آپ نہ بھی آتے تو کوئی اور آپ ہی کے فرائض انجام دیتا۔"

"میں نے آپ کی بات سمجھی نہیں۔"

دراصل میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ ملنا جلنا تو زندگی کے ساتھ لگا رہتا ہے۔"

اس بات پر وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ حالانکہ ہنسی کا یہ کوئی محل نہ تھا۔

لیکن اس کے ہونٹوں کے کنارے پر تبسم کی لکیریں ابھی تک ہویدا تھیں۔

"دراصل میں ایک اہم کام سے یہاں آیا تھا" یہ کہہ کر وہ قدرے رک سا گیا۔

اب اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کہیں غائب ہو چکی تھی۔

"باور کیجئے اس شہر سے میرا ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں لگاہے ماہے میں آتا رہتا ہوں۔ ہاں جمیل اپنے کاروبار کے سبب یہیں کا ہو کر رہ گیا ہے۔"

"اور میں ____؟"

"کہیں ایسا تو نہیں میں آپ کو بور کر رہا ہوں۔"

قبل اس کے کہ وہ اجنبی اپنی بات کو طول دیتا۔ اس نے قدرے ناگوار انداز میں کہا۔

پہیلیاں بجھانے سے بہتر یہی ہے کہ بات صاف اور مختصر انداز میں کی جائے۔"

"لگتا ہے جیسے آپ بڑی عجلت میں ہوں۔"

"ہاں آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔"

"ایسی صورت میں ____ ایسی صورت میں۔" جیسے وہ منھ ہی منھ میں بڑبڑایا۔

اس نے دروازے کے قریب ہی اپنی بیوی کے قدموں کی آہٹ سنی۔

"عجیب آدمی ہے۔ وہ مسلسل تمہیں بور کئے جا رہا ہے اور تم ہو کہ ____"

ارے بھئی آہستہ بولو۔ کہیں وہ مردود سن نہ لے۔ ہو سکے تو دو کپ چائے ہی بھجوا دو۔"

چائے پی کر تو وہ اور جھٹ چلے گا۔"

"ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔ میں اس سے نمٹ کر ابھی آتا ہوں۔"

"تم اس آدمی سے اتنے ڈر کیوں رہے ہو۔؟"

"میں کیوں ڈرنے چلا ــــــ؟"

مگر تمہاری پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کے یہ قطرے اسی بات ہی کی تو غمازی کر رہے ہیں۔

اس نے پردے ہٹ کر ڈرائینگ روم میں جھانکا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔

اس نے دیکھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سڑک پار کر رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ وہ اجنبی یہاں کس لیے آیا تھا اور اس طرح چلا کیوں گیا۔ یہ سب کچھ وہی جانے۔ مگر اس نے جمیل کا ذکر کیوں چھیڑ دیا۔

کیا سچ کا زہر پی سکو گے؟ اُسے لگا جیسے دور کسی گھاٹی سے کوئی اس کے زخموں کو کُرید رہا ہو۔ وہ چند لمحوں کے لیے یادوں کے بیکراں سمندر میں کھو سا گیا۔

اُسے اچانک یاد آیا کہ آج آفس میں باہر کی ٹیم انسپکشن کے لیے آئی ہوئی ہے۔ اسے ایک نہیں کئی اہم آفیسروں سے نمٹنا ہے۔

اور وہ ابھی تک۔

مگر یہ کیا ــــــ؟

یہ مردود جمیل اس طرف کیوں آرہا ہے۔ کم بخت کو اسی وقت آنا تھا۔

"جی تو نہیں چاہ رہا تھا کہ تمہارے پاس آؤں مگر ساجدہ بھابی کی خاطر ــــــ"

جمیل نے قدرے رُکتے ہوئے کہا۔ "خیر یہ چھٹی پڑھ لو۔ اب میں چلتا ہوں۔"

"بھائی صاحب!

تھوڑی دیر کے لیے وقت نکال کر گھر آجائیے۔
میں آپ کا انتظار کروں گی۔

ساجدہ ظفر

یکبارگی اسے لگا کہ جیسے ساجدہ ظفر کی جگہ ظفر والہانہ انداز میں اس سے کہہ رہا ہو۔
"یار دید کا بار اُٹھائے مدّت ہو گئی۔ آج کسی طرح گھر آجا۔
پتہ نہیں کل ......"

اور اس کے ساتھ ہی سب کچھ ہوا تھا۔ وہ پھر ایک بار اُداسیوں کے ہالے
میں گھر سا گیا۔

اب اس کا دھیان آفس کی طرف نہیں کہیں اور تھا۔ وہ سڑک پر پھیلے ہوئے
ٹریفک کے جال میں پھنس کر رہ گیا۔

"کیا ۱۹ نمبر والی بس چلی گئی ــــــ؟"
کیو میں کھڑے ہوئے بیشتر لوگوں نے حیرانی سے اُسے دیکھا۔
"یہ بس اسٹاپ تو ـــــ"
وہ سر جھکائے آگے بڑھ گیا۔

———o———

"یار تو نے بہت دیر کر دی"۔
مگر کچھ بگڑا نہیں۔
"وہ لوگ نہیں آرہے ہیں ـــ"
"کون لوگ ؟"

آفس کے سارے ساتھیوں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے کچھ اس طرح دیکھا جیسے وہ آدمی نہیں عجوبہ ہو۔

"لگتا ہے جیسے وہ کسی شدید صدمے سے دو چار ہو گیا ہو۔ ورنہ کبھی ہم نے اُسے اس عالم میں نہیں دیکھا۔

اب تو دیکھ لیا ہے نا۔ اس لیے اسے گھر چھوڑ آؤ۔ مگر یاد رکھو باہر لُو کے جھکڑ چل رہے ہیں ——!!

پھر کسی نے ٹیکسی والے کو آواز دی" ٹیکسی"۔

"یار اس سال بڑی سخت گرمی ہے۔"

"ہر برس گرمی کا یہی عالم رہتا ہے۔"

"اور سردی ——"

"پہلے گرمی سے تو نمٹ لیں۔"

"ڈرائیور بس یہیں روک دینا - کیا کار گیٹ میں گھسا دوگے

بھائی صاحب آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ - اگر آپ لوگ انھیں یہاں نہ لے آتے تو پتہ نہیں مجھے کتنی پریشانی اُٹھانی پڑتی"۔ اس کی بیوی نے تشکر آمیز انداز میں کہا۔

"بہن جی —— یہ تو ہمارا فرض تھا۔ ویسے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کیو شاید بہت لمبا تھا۔ اس لیے بس سٹاپ پر انھیں ۱۲ نمبر کی بس نہیں ملی"۔

"مگر یہ ۱۲ نمبر کی بس سے نہیں جاتے"۔

۱۴ نمبر کی بس۔؟

پتہ نہیں بڑ بڑاتے ہوئے اُنھوں نے کچھ ایسا ہی کہا تھا۔

"مگر ۱۴ نمبر کی بس تو ظفر کے مکان کو جاتی ہے۔"

"شاید ایسا ہی ہو"

جب سارے لوگ باگ چلے گئے تو اُس کی بیوی نے منھ ہی منھ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

مرنے والے نے تو جینے کی پوری قیمت چکا دی۔

لیکن یہ ساجدہ ظفر اُس سے اور کیا چاہتی ہے۔!!

●

فاصلے

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے اپنے پاؤں میز پہ پھیلا دیے سگریٹ سُلگایا اور کہا — "کیا کریں کچھ سمجھ میں نہیں آتا"۔

"کس سلسلے میں —" میں نے اس سے پوچھا۔

"کسی بھی سلسلے میں۔" اس نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

میں نے بھی خاموشی اختیار کی۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور کمرے میں پھیلی ہوئی اُداسی کو ٹٹولتے ہوئے کہا "روشنی کے نیچے بھی تو ایک سایہ لہراتا ہے۔ وہ آج کہاں ہے"

"اُس کا مقبرہ وہاں ہے۔ اِس دیوار کے پیچھے" میں نے زِچ ہو کر کہا۔

اُس نے کُھلی کھڑکی کے قریب پہنچ کر اپنی نِگاہوں کی روشنی کو چاروں طرف پھیلا دیا لیکن دور دور تک شاید اُسے سِوا اندھے راستوں کے کچھ نہ مِلا۔ پھر وہ زیرِ لب مسکراتا ہوا میرے قریب آیا اور کہا۔ "کیا چائے نہیں پیو گے؟"

حالانکہ یہ بات مجھے اِس سے کہنا چاہیئے تھی۔

"چائے آرہی ہے"۔

"بڑی حقیر چیز ہے چائے لیکن پھر بھی آدمی اسی کے سہارے ...."

اس نے اپنے جملے کو ادھورا چھوڑ دیا۔

اور جب نوکرانی نے چائے کی دو پیالیاں ہمارے سامنے لاکر رکھدیں تو اس نے ہاتھ بڑھا کر پیالی اٹھالی اور ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔"یار چائے بے حد گرم ہے۔ کیا کریں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

پھر وہ میز پر بے ترتیب انداز میں رکھے ہوئے اخبار کو اٹھا کر پڑھنے لگا۔

"یہ اخبار کل کا ہے آج کا اخبار اس طرف ہے"۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بے دلی سے کہا۔

"میں کل کا اخبار آج اور آج کا اخبار کل پڑھنے کا عادی ہوں تاکہ آج کے گزرے ہوئے کل سے نجات حاصل کرسکوں۔ لیکن پھر بھی نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ کوئی چور دروازہ بھی نہیں ہے"۔

میں نے اس کی توجہ پھیرنے کے لئے کہا۔"کتنا خوشگوار موسم ہے آج اور ہوائیں۔"

اس نے منھ پھیر کر کہا۔"تم کن ہواؤں کی بات کر رہے ہو۔"

میں نے اس خوف سے کہ کہیں وہ ہواؤں کی قسمیں اور اس کے اچھے بُرے اثرات کی تشریح نہ شروع کردے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔"کیا ایک اور چائے پیوگے؟"

"زیادہ مہذب بننے کی کوشش نہ کرو"۔ یہ کہکر اس نے میری زبان بند کردی۔

"دراصل مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے"۔

"تو پھر کھانا کھالو ـــ"

"کہاں ـــ؟"

"یہیں اور کہاں ـــ"

"اِس گھر میں ——؟" اس نے تعجب اور حقارت کے ملے جلے جذبات میں ڈوب کر کہا۔

"کیا تم نے اس گھر میں کبھی کھانا نہیں کھایا ——؟"

"ضرور کھایا ہے مگر کھانا نہیں ....؟"

اُس کی اِن کٹیلی باتوں اور چبھتے ہوئے جملوں سے مجھے شدید کوفت ہو رہی تھی۔ وہ میرا قریبی دوست رہ چکا تھا لیکن یاری کی وہ گرمی اب باقی نہ رہی تھی۔ اِس بات کا احساس مجھے بھی تھا اور اُسے بھی۔

"یہاں مجھے بڑی گھٹن کا احساس ہو رہا ہے آؤ باہر چلیں۔" یہ کہہ کر اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔ میری بیوی نے دروازے میں سے جھانکتے ہوئے ہلکا سا اشارہ کیا۔ "ذرا جلدی گھر لوٹنا ——"

میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"لگتا ہے تم بیوی کو کچھ زیادہ ہی چاہتے ہو۔ اس طرح تم اپنی قبر آپ کھود رہے ہو۔ چلو یہ بھی ٹھیک ہے لیکن میرا معاملہ جدا ہے۔ میں جانوروں سے پیار کرتا ہوں۔ پرندوں کا تو میں عاشق ہوں۔ بس یہی فرق ہے تم میں اور مجھ میں۔"

آخری جملہ کہتے کہتے وہ سڑک پر ایک راہرو سے ٹکرا گیا۔ نہ اس نے معافی چاہی اور نہ اِس آدمی نے اس سے کچھ کہا۔

اِس نے پھر ایک بار میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "نہ تم نے میرے کومنٹ کا جواب دیا اور نہ اِس راہرو نے مجھ سے آنکھ ملانے کی جرأت کی۔ میرے لیے دونوں قابلِ رحم ہیں"۔

میں راستہ چلتے ہوئے چپ چاپ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ پہلے تو یہ آدمی ایسا نہ تھا۔ مگر اب تو دو دھاری تلوار بنا ہوا ہے۔ پتہ نہیں کب کس کی گردن پر گر جائے۔ میں نے چپ رہنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی مگر وہ مسلسل مجھے طنز کا ہدف بناتا رہا۔ پھر قدرے دھیمی آواز میں کہا۔ "پتہ نہیں یہ سالی بھوک آج مجھے کیوں ستا رہی ہے۔ حالانکہ صبح میں نے اچھا خاصا کھایا تھا۔ یار تم میری باتوں کا کوئی جواب ہی نہیں دے رہے ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے میرے لیے بات کرنے کا جواز پیدا کر دیا تھا۔

"نئی سڑک کے اُس پار سنا ہے ایک نیا ہوٹل کھلا ہے وہیں چل کر کھا لیں۔ کیا خیال ہے تمہارا——"

میں نے تجویز رکھی۔

"بھوک کس مردود کو ہے"۔ اس نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

اور میں حیرت میں ڈوب کر رہ گیا۔

پھر راستہ چلتے چلتے وہ اچانک رک گیا۔

"دیکھ نہیں رہے ہو سامنے کیا ہو رہا ہے۔" اس نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے سامنے دیکھا۔ بھانت بھانت کے لوگوں کے قافلوں کے علاوہ وہاں کچھ نہ تھا۔

"مگر وہ سامنے شمشان گھاٹ۔ وہاں میری چتا جل رہی ہے"۔

تمہاری چتا جل رہی ہے اور تم یہاں سڑک پر کھڑے اپنی موت کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہے ہو——؟"

"ہاں میرے ساتھ بارہا ایسا ہوا ہے۔ موت کے قرب ہی سے مجھے زندگی ملتی ہے۔
لیکن وہ اپنے ہوٹل میں چل کر کھانے کا کیا بنا۔"

اب اس کی توجہ موت سے ہٹ کر کھانے کی طرف منعطف ہو چکی تھی۔

میں دل ہی دل میں ایک طرح کی طمانیت محسوس کر رہا تھا کہ وہ اب نارمل ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے اس کے موڈ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "کوئی نئی فلم ہی کیوں نہ دیکھ ڈالیں۔"

اس نے حامی بھری تو مجھے اور زیادہ خوشی ہوئی لیکن مجھے اس کے ساتھ مسلسل پیدل چلتے ہوئے تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ میری اس تھکن سے بے نیاز بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا سڑک پر چلا جا رہا تھا۔

میں نے تھک ہار کر اس سے کہا۔ "کیا تم ٹیکسی یا آٹو رکشا میں بیٹھنے کے قائل نہیں ہو۔"

"نہیں مجھے پیدل چلنے میں لطف آتا ہے۔" اس کے اس جواب سے میں چپ ہو کر رہ گیا۔ سامنے نئی سڑک پر ایک جگمگاتا ہوٹل منہ کھولے جیسے ہمیں بلا رہا تھا۔ میں تیزی سے ہوٹل میں داخل ہو گیا تاکہ وہ بھی جھپٹ کر اندر داخل ہو جائے۔ لیکن وہ ابھی تک ہوٹل میں داخل ہونے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ سڑک گرد سے نہیں لوگوں سے اٹی ہوئی تھی اور سڑک پر نئے ماڈل کی کاریں ایک دوسرے کے تعاقب میں جیسے ریس کر رہی تھیں۔

اس نے سڑک پار کرنے میں کافی دیر لگا دی تو میں نے زور سے ہانک لگائی۔

"یار آ بھی جاؤ۔ ٹریفک تو کم ہونے سے رہی۔"

مگر اس نے اپنے حساب ہی سے آنے کی کوشش کی۔ جب وہ ہوٹل میں داخل ہوا تو میں نے

مینو اس کے سامنے رکھ دیا تاکہ وہ اپنے لیے کوئی اچھی سی ڈش منتخب کر سکے۔

بیرا اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے بیرے سے کہا۔

"آج تم اپنی پسند سے جو بھی کھلا دو وہ ہمیں منظور ہے۔ یہ مینو یہاں سے ہٹا لو۔"

بیرے نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "جیسے آپ کی مرضی۔"

کافی دیر گزر جانے کے بعد بیرے نے کھانا لانے کے بجائے کافی کی دو پیالیاں اس کے سامنے رکھ دیں اور آگے کی ٹیبل کی طرف بڑھ کر دوسرے آئے ہوئے گاہک سے آرڈر لینے لگا۔

"یہ بیرا واقعی سمجھدار ہے" اس نے مسکراتے ہوئے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے بڑی بے معنی سی لگی۔

"یار کیا کریں کچھ سمجھ میں نہیں آتا —" اب اس کے لہجے میں تناؤ تھا۔

"کس سلسلے میں —" اچانک میری زبان سے نکل گیا۔

"کسی بھی سلسلے میں —" اس نے اسی انداز میں جواب دیا اور کافی پینے میں مشغول ہو گیا —!!

•

ڈپریشن

اِس نے کنکھیوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو آرام کرسی پر جھولتا ہوا شام کے اخبار کی سرخیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جب وہ ہمیشہ کی طرح آفس کی فائیلیں تھامے ہوئے چوروں کی طرح گھر میں داخل ہوا تو خلافِ معمول اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے جیسے کام کی تھکن سے اکتا کر اس نے تھوڑی بہت برانڈی پی لی ہو۔۔۔ مگر نہیں اس میں اتنی سکت ہی کہاں ہے۔ وہ تو۔۔۔ وہ یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ اس کے شوہر نے چائے کی ایک پیالی کی اس طرح فرمائش کی جیسے وہ شوہر نہ ہو کوئی اجنبی ہو۔

وہ بڑی بے دلی کے ساتھ باورچی خانے میں گئی کیتلی میں دھری ہوئی بچی کھچی چائے کو چولھے پر چڑھایا اور اس کے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھ گئی۔

"میں نے آفس پر تمھیں فون کیا تھا تمھارے بدتمیز چپراسی نے مجھے بتایا کہ چار بجے دوبارہ فون کریں۔ صاحب سیٹ پر نہیں ہے۔"

"صاحب سیٹ پر بھی نہیں۔ گھر پر بھی نہیں تو وہ آخر کہاں مرکھپ گیا تھا کچھ تو معلوم ہو"

وہ بڑی دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ مگر اس نے اپنی بیوی کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ اور ہمیشہ کی طرح اخبار کی سرخیوں میں ڈوبا رہا۔

اچانک پھر کسی نے گھر پر دستک دی۔ دستک کی آواز اس کے لئے مانوس سی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہاں دور دور تک کوئی نہ تھا۔ اندر آکر اس نے دبے لہجے میں اپنی بیوی سے پوچھا۔ "کیا تم نے دستک کی آواز سنی تھی"

"ہاں سنی تھی مگر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ کوئی تمھیں کھا نہیں لے گا۔ باہر دوبارہ جاکر دیکھو تو کہیں آس پاس ہی وہ کھڑا ہو گا۔ مگر پہلے چائے تو پی لو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ خفگی کے باوجود اس کی بیوی اس طرح اس کے لیئے چائے بنا لائے گی۔ پھر یکبارگی وہ اٹھ کھڑا ہوا جیسے کوئی اہم کام اچانک اُسے یاد آگیا ہو۔ باہر نکل کر اس نے آٹو رکشا والے کو آواز دی۔ نیا سٹیشن" اور نئے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر آج بھی اُسی طرح کی بھیڑ تھی۔ کل وہ اسی بھیڑ میں پھنس کر رہ گیا تھا اور آج پھر اسی ہجوم میں گھرا ہوا وہ دھکے کھا رہا تھا۔ وہ چاہتا تو دو ایک دن گھر ہی پر آرام کر لیتا لیکن — اور اس زہریلے لیکن ہی میں جیسے اس کی ساری زندگی ڈول رہی تھی۔ ہجوم کو چیرتا ہوا جب وہ آگے بڑھا تو اسے کسی نے بتایا کہ روپ نگر والی گاڑی آج لیٹ ہے۔ وہ ابھی تک سٹیشن پر کھڑی ہوئی ٹرین ہی کو روپ نگر والی گاڑی سمجھ رہا تھا۔

"کیا آپ کو بھی روپ نگر والی ٹرین پکڑنی ہے" مجمع میں سے کسی نے پوچھا۔

اس نے بڑی بے دلی سے کہا۔ شاید"

شاید؟ یہ بھی ٹھیک ہے سفر میں آگے جانے والا کبھی کبھی اتنا پیچھے رہ جاتا ہے کہ اس کی پہچان بھی مشکل ہو جاتی ہے۔

یکبارگی وہ سوچ کی گہرائیوں میں ڈوب گیا ایک انجانا سا خوف واہمے کی صورت میں اس کے اِدگرد ہی کہیں منڈلا رہا تھا۔

سفر میں آگے جانے والا کبھی کبھی......

نہیں نہیں اپنی شناخت مجھے کروانی نہیں ہے۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

جاتے جاتے جب اس نے بھیڑ میں پھنسے ہوئے اجنبی کو دیکھا تو وہ خاص انداز میں مُسکرا رہا تھا۔ اس کے لبوں پہ آئی ہوئی مُسکراہٹ کی وہ لکیر اسے بڑی زہریلی لگی۔

اس کا جی چاہا کہ بھیڑ میں پھنسے ہوئے اس آدمی کا گلا دبا دے مگر وہ بغیر کچھ کہے سٹیشن سے لگے خوب صورت رستوران میں داخل ہو گیا۔

"جانم یہاں کی بلیک کافی کا کیا کہنا۔ بڑی عجیب شئے ہے۔ یہ کافی بھی۔"

بلیک کافی کے ساتھ ہی اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ میں نے کافی کا آرڈر دے دیا ہے۔"

"کھانا نہیں کھاؤ گی؟"

نہیں اس وقت کافی کے دو پیالے ہی بس ہیں میں نے گھر پہ چند اچھی ڈشیں تیار کر رکھی ہیں؛

"صاحب کیا بلیک کافی چلے گی۔"

اس کے ذہن پر پھر ایک بار کسی نے ہتوڑا مارا۔

"کچھ بھی لا دو۔ — اس نے نڈھال لہجے میں کہا۔ پھر اطراف و اکناف پر چھچلتی ہوئی نظر ڈالی"۔

آج بھی یہاں وہی رونقیں تھیں، وہی کھنکتے ہوئے قہقہے تھے۔ وہی مدھم سی روشنی تھی لیکن آسمان کے طشت پر وہ خوبصورت ستارے نہ تھے جنہیں دیکھ کر بھی وہ۔

ارے یہ تو وہی پلیٹ فارم والا اجنبی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اسٹیشن ہی سے اس کا تعاقب کر رہا ہو۔ وہ کسی اور رستوراں میں بھی تو جا سکتا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ خواہ مخواہ خوفزدہ ہو گیا۔ اپنے اس خوف کو دور کرنے کے لیے اس نے ٹیبل ہی پر انگلیاں چلانی شروع کر دیں لیکن وسوسوں کے سائے پھیلتے ہی گئے۔ پتہ نہیں یہ احساس اسے کیوں ہوا کہ وہ جھپٹ کر اس کی برابر والی کرسی پر آ کر آرام سے بیٹھ جائے گا۔ اس سے ہر وہ سوال پوچھے گا جس کا جواب ڈھونڈوں نہ ملے۔

اس نے چور نگاہوں سے اجنبی کی طرف دیکھا۔ اب وہ کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جیسے جانے کے لئے پر تول رہا ہو۔

"مگر یہ کیا — پھر اس نے اپنی کرسی سنبھال لی ہے۔ مردود مرتا بھی تو نہیں"۔

"کچھ اور چاہیے صاحب؟"

نہیں نہیں — یہ رہی یہاں زیادہ دیر بیٹھنے کی ٹپ"۔

"صاحب وہ سامنے والا آدمی ہے نا؟"

"ہاں ہاں کیا کیا ہے اس نے۔ ؟"

اب تک وہ کئی پیالے کافی کے پی چکا ہے۔ شاید اب ......

"کافی — ؟"

"کیا بلیک کافی؟"

پھر اسے احساس ہوا کہ جب تک وہ یہاں بیٹھا رہے گا۔ وہ کہیں نہیں جائے گا۔

• دیکھتا ہوں کہ وہ سالا یہاں کب تک بیٹھتا ہے۔

لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اُسے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس کی سیٹ خالی ہو چکی تھی اور وہ جا چکا تھا۔

جب وہ چلا گیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے وقتی طور پر یہ احساس ہوا کہ اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے وسوسوں کے جال سے وہ نجات پا چکا ہے۔ لیکن اس کے اندر کا آدمی کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ جیسے وہ اگر کہیں گیا بھی ہو تو پھر آدھمکے گا۔

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب وہ یہاں نہیں آئے گا۔ کبھی نہیں آئے گا۔"

"صاحب ماچس؟"

"ماچس؟"

"ہاں صاحب اس کونے میں بیٹھے ہوئے آدمی نے آپ کے پاس سے ماچس لانے کو کہا ہے۔"

"اُسے میرے علاوہ کوئی اور آدمی نہیں ملا۔"

"پتہ نہیں صاحب۔ کبھی میں خود اپنے گاہکوں کے لیے ماچس رکھا کرتا تھا لیکن اب ہوٹل کے مینیجر نے منع کر دیا ہے۔"

"کیا اس آدمی نے بھی بلیک کافی منگوائی ہے؟"

"ابھی تو وہ سموسے کھا رہا ہے۔ پتہ نہیں آگے کیا آرڈر دے گا۔"

"کیا ماچس ملے گی صاحب؟"

"ہاں ہاں لے جاؤ۔ مگر اس میں چند ہی تیلیاں ہیں۔ شاید یہی اس کے کام آجائے۔"
بیرا ماچس لے کر چلا گیا تو وہ سٹیشن جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے لگا جیسے نیا سٹیشن منہ پھاڑے اس کا منتظر ہو۔

جب وہ پلیٹ فارم پر پہنچا تو اس کی نگاہ اُس بلیک بورڈ پر گئی جہاں تھری آورس لیٹ کی جگہ SIX HOURS لیٹ لکھا تھا۔

انکوائری ونڈو کے اندر بیٹھا ہوا چیچک زدہ آدمی اُسے دور سے بڑا بھیانک لگا۔ اُسے خواہ مخواہ احساس ہوا کہ وہ آدمی ضرور بدتمیز ہوگا اور چڑچڑا بھی۔ مگر بوڑھا اسٹیشن ماسٹر تو بھلا سا آدمی لگ رہا ہے۔ کیوں نہ اسی سے پوچھا جائے کہ روپ نگر جانے والی گاڑی آئے گی بھی یا نہیں۔

اب وہ انکوائری ونڈو سے چھٹے ہوئے، چیچک زدہ آدمی کے پاس جانے کے بجائے بوڑھے اسٹیشن ماسٹر کے روبرو کھڑا تھا۔

"وہاں ساری پٹریاں طوفانی بارش کی زد میں آچکی ہیں۔ طوفان کچھ رُکے تو مُسافروں کو نجات بھی ملے۔"

"نجات کا سگنل کب اور کس وقت گرے گا یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔" قریب ہی کھڑے ہوئے آدمی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہی پلیٹ فارم والا اجنبی منہ میں سگریٹ دبائے مسکراتا کھڑا تھا۔

یہ خبیث پھر کہاں سے آٹپکا۔ کتنا ڈھیٹ ہے سالا۔ جانے کا نام ہی نہیں لیتا۔ جونک کی طرح چمٹ گیا ہے۔ اس کا جی پھر ایک بار چاہا کہ اُسے پلیٹ فارم سے اٹھا کر گہری سیاہ پٹریوں پر پھینک دے۔ مگر اس بار بھی وہ ایسا نہ کرسکا۔ آخر وہ اس سے چاہتا کیا ہے۔

کچھ نہ کچھ چاہتا ہی ہوگا۔ تب ہی تو وہ اس کے تعاقب میں لگا ہوا ہے۔

مگر روپ نگر جانے والی وہ گاڑی ؟

جیسے پھر ایک بار اس کی نگاہوں کے سامنے وسوسوں اور خوف کے بطن سے جنم لینے والے وہی ٹیڑھے میڑھے بھوت اس کا راستہ روکے کھڑے تھے۔

راستہ جو مسافت کا محتاج تھا اور منزل جیسے دور کھڑی کسی چڑیل کی طرح اس کا منھ چڑا رہی تھی۔

پھر اچانک اسٹیشن پر ایک شور سا بلند ہوا کہ سگنل گر چکا ہے۔ گاڑی آ رہی ہے۔

گاڑی آ رہی ہے اس سے پہلے کہ پلیٹ فارم پر گاڑی سانس لینے کو ٹھہرتی وہ چپکے سے باہر نکل آیا اور ٹریفک کے جال میں کہیں پھنس کر رہ گیا۔۔۔!!

پتھّر کی خوشبو

"یاد کیا تم بھی چھٹی منزل والی فرم میں سروس کرتے ہو؟"

"نہیں پانچویں منزل پر"۔ لیکن مجھے اجنبی کا یہ بے تکلفانہ انداز بڑا ناگوار گزرا میرے چہرے پر آئی ہوئی خفگی کو شاید اس نے پڑھ لیا۔ اور پھر دھیمے لہجے میں کہا۔ "مجھ میں یہ بڑا عیب ہے کہ کوئی مجھ سے بات کرے یا نہ کرے میں اُسے چھیڑ کر ضروریات کرتا ہوں۔ میری اس عادت سے بیوی تک نالاں ہے۔ مگر کیا کیا جائے عادت سے مجبور ہوں۔

ہم دونوں پرانی خستہ حال لفٹ کے قریب کھڑے تھے۔

"ارے آس پاس لفٹ والا بھی نہیں۔ پتہ نہیں مردود کو آج کیا ہو گیا۔ وہ مسلسل باتیں کئے جا رہا تھا اور میں اس کی لایعنی باتوں سے اُوب چکا تھا۔ شاید وہ میری خاموشی کو بھانپ گیا۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد پھر اس نے اپنی چادر سے پاؤں نکالے۔

"چلو وہ اب نہیں آئے گا۔ یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے لفٹ کے اندر اس طرح گھسیٹا کہ میں ارے ارے یہ کیا کر رہے ہیں آپ سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا

پانچویں منزل پر پہنچ کر اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔" حضور یہ رہی آپ کی منزل ——"

میں نے اترتے وقت اس کا شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ مجھے یہ آدمی حقیقتاً بڑا نامعقول لگا۔ دفتر پہنچ کر میں نے فائیلوں پر نگاہ ڈالی۔ میری میز فائیلوں سے اٹی پڑی تھی۔

"مجھے پتہ ہے تم آج اس سیکشن آفیسر کے چنگل میں پھنس گئے تھے۔"

"کون سیکشن آفیسر۔"

"ارے بھئی وہی چھٹی منزل والا ——۔"

تمھیں کیسے پتہ ——"

میں نے تم دونوں کو لفٹ کے قریب دیکھا تھا۔

"کیسا آدمی ہے وہ؟"

"برا نہیں —— لیکن ذرا ٹریک سے ہٹا ہوا ہے۔ چھٹی منزل پر تو وہ ہر دل عزیز ہے ہی۔

لیکن اب پانچویں منزل پر بھی وہ آہستہ آہستہ اپنے پاؤں پھیلا رہا ہے۔

لیکن ہے بڑا ٹیپیکل اور دلچسپ آدمی ——"

"مگر مجھے تو وہ آدمی بڑا بور لگا۔"

تمھیں تو ہر آدمی بور لگتا ہے۔ لیکن یہ بوریت شاید خود تمھاری اپنی"

میں نے اس کے اس ریمارک کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور فائیلوں پر جھک گیا

"کیا برا مان گئے۔" اس نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے وہ مجھ سے معافی کا

خواستگار ہو۔ میرے کہنے کا یہی مطلب تھا کہ زندگی بڑی مختصر ہے۔ جو بھی لمحہ ملے اسے ہنس بول کر گزار دو۔ مگر یہ بات مجھے ڈھنگ سے کہنی چاہیئے تھی۔ مگر میں ـــ یہ کہہ کر اس نے میرے چہرے کا جائزہ لیا۔

میرے چہرے پر اچانک مسکراہٹ رینگ گئی اور میں اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا۔

"یہ ہوئی نا بات ۔ سُنو باس چھٹی پر ہے۔"

"لیکن کام تو بہر حال کرنا ہی ہے"۔

"کام کبھی رُکا ہے اور نہ رُکے گا ـــ" اس کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔

"ایک بات تمھیں بتا دوں وہ چھٹی منزل والا ہے نا۔ وہ قرض لینے میں بڑا طاق ہے۔ جب بھی موقع ہاتھ آئے کچھ نہ کچھ لیتا ہی رہتا ہے۔"

"کیا کبھی تم نے بھی اُسے کچھ دیا تھا؟"

"ہاں صرف ایک بار دو سو روپے۔"

لیکن پیسے لوٹانے میں وہ جتنا بخیل ہے۔ کھلانے پلانے میں اتنا ہی سخی۔ تم یاد نہیں کرو گے کبھی اس نے بل مجھے PAY کرنے نہیں دیا۔ ہمیشہ مجھ پر بے دردی سے پیسہ لُٹاتا رہا۔

"پھر وہ آج کل تم سے ملنے کیوں نہیں آتا ـ؟"

"اُس نے مجھ سے بات بند کر دی ہے"

"کوئی وجہ ـــ؟"

یہ ایک طویل کہانی ہے۔ میں مختصراً سناتا ہوں۔

مجھے ایک دِن پیسوں کی ضرورت تھی۔ میں نے اُسے اُن دوسو روپوں کی یاد دلائی جو اس نے مجھ سے قرض لیے تھے پتہ ہے اُس نے مجھ سے کیا کہا۔

"بڑے گھٹیا آدمی ہو یار"

اس نے مجھے گھٹیا آدمی کا طعنہ ضرور دیا لیکن میرے پیسے نہیں لوٹائے۔

اب میں سوچتا ہوں گھٹیا آدمی وہ تھا یا میں۔ کیا قرض دے کر مانگنے والا واقعی گھٹیا آدمی ہوتا ہے۔ "کچھ تو کہو یار۔" اس نے سوالیہ انداز میں میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

میں چپ سا ہو کر رہ گیا اور چھٹی منزل والے کردار کی بوقلمونی کے بارے میں غور کرنے لگا۔

"کچھ تو کہو یار کس سوچ میں گم ہو گئے۔"

یہ آدمی بھی بڑا عجیب و غریب جانور ہے۔ اندر سے کچھ اور ہوتا ہے اور باہر سے کچھ اور دراصل ہم سب خود غرض ہیں۔ اب یہی دیکھو نا کہ اس نے تم پر کافی روپے لٹائے۔ مگر تمہیں دو سو روپے کا غم کھائے جا رہا ہے"۔

"مگر یاری میں لین دین بھی تو کوئی چیز ہے"۔

"دوستی میں ایسا کوئی خانہ نہیں ہوتا کہ ہم ایک چیز رکھ کر کوئی دوسری چیز اٹھالیں۔

وہ میرے اس جواب کو سُن کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اُسے یہ توقع نہیں تھی کہ میں اونچی سطح کی آخری منزل پر پہنچ کر اس طرح اُسے کوڑے لگاؤں گا۔

کہنے کو تو وہ چپ ہو کر رہ گیا۔ لیکن چہرے سے لگتا تھا جیسے وہ اچانک کسی غیر متوقع حادثے کا شکار ہو گیا ہو۔

جب وہ چلا گیا تو میں سوچ کی وادیوں میں گم ہو گیا۔ پتہ نہیں آدمی اپنی بات کی تائید کے لیے کیوں مرا جاتا ہے۔ اس کا اس طرح سے خاموشی سے اٹھ کر چلا جانا خود اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کے اندر توڑ پھوڑ شروع ہو چکی ہے۔ باہر اور اندر کے انسان کی یہ جنگ بھی عجیب شے ہے۔

جب بھی میری کم آمیزی جاگتی ہے تو پتہ نہیں مخاطب کیوں اُداس سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی میرے دوست کے ساتھ ہوا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ میری صاف گوئی کا یوں بُرا مانے گا۔

میں نے باہر آکر دیکھا۔ چھٹی منزل والا لفٹ سے نیچے اُتر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوب صورت عورت بھی تھی جو گہرے کلر کی ساری میں اور بھی بھلی لگ رہی تھی۔

"کون ہو گی وہ ——؟" ایک لمحے کے لیے میں سوچ میں ڈوب گیا۔ لیکن میرے اندر کے انسان نے کہا۔ کوئی بھی ہو گی۔ تجھے اس سے کیا لینا دینا۔ ہر سوال ہر تجسس پر مجھے یہی جواب ملتا۔

دراصل میں اس فرم میں نیا نیا آیا تھا۔ آفس میں عاصم کے علاوہ بہت کم لوگوں سے میری یاری تھی۔ یہاں کام کرنے والے سب ہی لوگ بڑی مستی سے زندگی گزار رہے تھے لگتا تھا جیسے یہ لوگ تنخواہ کے بجائے اپنی پاکٹ منی وصول کر رہے ہوں۔ مگر نہیں یہ میری اپنی سوچ کے پیچ و خم تھے۔ شاید میں بھی اُن ہی میں سے تھا۔

میں نے دیکھا باہر سڑک پر ٹریفک کا ایک جال سا بچھ گیا تھا اور آسمان کے چہرے پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے جیسے اب بارش ہونے ہی والی ہو۔

اور تو اور سندھی ہوٹل میں بھی لوگوں کا کافی اژدحام تھا۔

میں نے ہوٹل میں جھانک کر دیکھا یہاں مجھے عاصم بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے ٹیبل پر کافی کی خالی پیالی دھری تھی اور وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے میرا جی چاہا کہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کے دل کے غبار کو دھو ڈالوں لیکن میں ایسا نہ کر سکا اور اپنی قیام گاہ لوٹ آیا۔

دوسرے دن آفس میں وہ مجھ سے کچھ کھنچا کھنچا سا رہا۔ میں نے بھی سوچا کہ اس کنکوے کو اور بھی اکڑنے دو۔ جب بات زیادہ گمبھیر ہو جائے تو اُسے گلے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے دو چار دن ہی میں وہ پہلے کی طرح شگفتہ دکھائی دینے لگا۔

اس نے میرے دل میں یہ احساس پیدا ہونے ہی نہیں دیا کہ میں نے کبھی اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ آفس میں لے دے کر ایک وہی تھا جس سے معقول اور غیر معقول باتیں کی جا سکتی تھیں۔ ورنہ دوسرے تو سب ہی ست رام تھے۔

ایک دن وہ اپنا کام ختم کر کے میرے ٹیبل کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"اب اٹھو بھی یار سب لوگ جا چکے اور تو اور رامو چپراسی بھی تمہارے اٹھنے کا منتظر ہے۔ میں نے رامو کی طرف دیکھا تو وہ اس طرح مسکرایا جیسے کہہ رہا ہو۔ بابو صاحب نے جو کچھ کہا۔ وہ کچھ غلط نہیں ہے۔

پھر وہ مجھے سندھی ہوٹل کھینچ لایا۔ روز کی طرح آج بھی یہاں ہجوم تھا۔ وہ کچھ دیر کاونٹر سے لگا کھڑا رہا جب دو میزیں خالی ہوئیں تو وہ تیزی سے میرا ہاتھ پکڑے کرسی پر جا بیٹھا۔ سر پر منڈلاتے ہوئے بیرے سے میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے دو پلیٹ سموسے کا آرڈر دے دیا۔

"کوئی خاص بات؟"

متھرا میں ہماری برانچ کھل رہی ہے اور چھٹی منزل والا اپنی کمپنی کی طرف سے مینیجر بن کر جا رہا ہے"۔

"اس سے ہماری فرم کا کیا تعلق۔؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ڈائرکٹر تمہیں بھی ایک ہفتے کے لیے وہاں بھیج رہا ہے"۔

"مجھے کس خوشی میں وہاں بھیجا جا رہا ہے؟"

"تمہاری صلاحیتوں کا امتحان لینے کے لیے بس سات دن ہی کی تو بات ہے۔ مگر ہاں واپسی میں میرے لئے متھرا کے پیڑے ضرور لانا۔"

"اور کچھ"

"میرے لیے بس یہی کافی ہے"۔

سموسے کی پلیٹ خالی ہو گئی تو بیرے سے اس نے کافی لانے کو کہا۔ جب کافی آگئی تو میں نے کافی کا ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

"عجیب بات ہے۔ باس مجھے وہاں کیوں بھجوانا چاہتا ہے۔ جب کہ تم مجھ سے زیادہ سینیر اور تجربہ کار ہو"۔

"سنا ہے چھٹی منزل والے نے باس سے کہہ کر میرا نام کٹوا دیا ہے اور میری جگہ تمہیں بھجوایا جا رہا ہے۔ خیر تم میرے لیے غیر تھوڑے ہی ہو"۔

اب بھی اگر تم انڈر سٹینڈ ہو تو مجھ سے کہنا میں کوشش کروں گا کہ ہماری فرم ایک جونیر سے زیادہ سینیر کی خدمات سے فائدہ اٹھائے"۔

میرے اِس COMPLIMENT پر اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک ہویدا ہوگئی اور جب کافی دیر ہوگئی تو وہ مُسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے اپنی قیام گاہ کی راہ لی۔

پھر دوسرے دن لِفٹ کے قریب مجھے چھٹی منزل والا دکھائی دیا۔ مجھے کنّی کاٹتے ہوئے دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے مجھے "ہیلو" کہا۔

"عجیب آدمی ہو تم جتنا مجھ سے بھاگو گے۔ میں اِتنا ہی تمہارا پیچھا کروں گا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ سراسر آپ کی غلط فہمی ہے۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو پھر آجاؤ لِفٹ میں۔ آج پھر میں لِفٹ کا بٹن دباؤں گا۔ ہوسکتا ہے پانچویں منزل چھٹی منزل میں تبدیل ہوجائے۔"

میں نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ "کیا اس بوڑھے نے پھر رخصت لے رکھی ہے؟"

"ہاں۔ مگر تم گھبراؤ نہیں۔ ایسا لگتا ہے تم بھی اپنے باس کی طرح لِفٹ سے گھبراتے ہو۔ بس ایک بٹن دبانے کی دیر ہے۔ پھر پانچویں منزل۔ چھٹی منزل۔ اور......"

وہ آج مجھے بڑا پُراسرار لگ رہا تھا۔ میرے چہرے پر آئی ہوئی گھبراہٹ کی لکیر کو دیکھ کر اس نے مزا لیتے ہوئے کہا "بس اتنی سی بات پر پسینے چھوٹ گئے۔"

واقعی میں طرح طرح کے وسوسوں سے دوچار تھا۔ پانچویں منزل پر پہنچ کر جب اس نے "باہر آئیے حضور" کہا تو میری جان میں جان آئی۔

میں جب آفس میں داخل ہوا تو سب ہی لوگ میز پر جھکے ہوئے تھے۔ حاضری کے رجسٹر میں دستخط کرنے کے بعد میں نے اپنی کرسی سنبھال لی۔ مجھے آفس آنے میں آج ذرا دیر ہوگئی تھی۔ میں نے قریب بیٹھے ہوئے عاصم سے سرگوشیانہ انداز میں پوچھا ـــــــ

"کیا صاحب نے مجھے یاد تو نہیں کیا۔"

"نہیں وہ آج دیر سے آئیں گے"

"کیا بات ہے تمہیں سب پتہ رہتا ہے"

"کوئی خاص بات نہیں PA نے مجھ سے کہا تھا۔"

ادھر مجھے آفس آتے جاتے ایک ہفتہ گزر گیا لیکن متھرا جانے والی بات سامنے نہ آئی میں نے عاصم سے یہ نہیں کہا کہ اس نے خواہ مخواہ یہ گپ کیوں اڑائی لیکن وہ خود اندر سے پشیمان سا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن ایک دن وہی ہوا جس کی عاصم نے نوید دی تھی۔ مگر متھرا میں مجھے زیادہ دن ٹھیرنا نہیں پڑا۔ وہاں تو چھٹی منزل والے کا راج تھا۔ وہی سب کچھ کر رہا تھا اور میں خالی خولی اس کے پیچھے گھوم رہا تھا۔ جب لوٹنے کا وقت آیا تو وہ اسٹیشن پر مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے آیا۔ اس بار اس کے برتاؤ میں افسروں کا سا دبدبہ تھا۔ لیکن خلوص کی خوشبو برقرار تھی۔

گاڑی جب جھٹکے کے ساتھ چلنے لگی تو اس نے آگے بڑھ کر ایک لمبا لفافہ میرے ہاتھ تھماتے ہوئے کہا۔ یہ مردود عاصم کو دے دینا۔ ایک ماہ بعد تم سے پھر ملاقات ہوگی۔

پھر وہی بازار — وہی سڑکیں — وہی لوگ — اور وہی میری اپنی قیام گاہ اچانک میرے کانوں سے ایک مانوس سی آواز ٹکرائی۔

"ارے تم آگئے" یہ عاصم تھا۔

"یار جاتے جاتے بھانپ لیا کہ شاید تم آگئے ہو۔ اب تم آرام کرو۔ میں تم سے لوٹتے ہوئے ملوں گا۔"

سفر کی تھکن مجھ پر کچھ اتنی طاری تھی کہ میں اسے کافی بھی پلا نہ سکا۔

شام کو لوٹتے ہوئے اس نے میرے کمرے پر دستک دی۔

میں نے اندر ہی سے کہا۔ "دروازہ بند نہیں ہے آجاؤ یار۔"

"میرے لیے پیڑے تو لائے ہونا۔"؟

"کیوں نہ لاتا ۔۔۔ مگر ایک اور تحفہ بھی تمہارا منتظر ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ میں وہ لمبا لفافہ تھما دیا۔

اُس نے تیزی کے ساتھ لفافہ کھولا تو سو سو کے پانچ نوٹ فرش پر بکھر گیے۔

"سالا چھٹی منزل والا ۔۔۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔

آخر دوسروں کی بھی تو کوئی عزت ہے۔"

وہ یکبارگی غصّے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا اب وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اُتر رہا تھا!

چُبھَن

ایک بے حد دبلے پتلے مُنحنی قسم کے نوجوان کی اُنگلی تھامے ایک ننھا منا سا بچہ سڑک پر سہما سہما سا چل رہا تھا۔

"بابا گیس غبارہ ——" سڑک پر گیس غبارہ فروخت کرنے والے لڑکے کو دیکھ کر بیٹے نے مچلتے ہوئے کہا ——

"واپسی میں لیں گے ——" باپ نے تپے تلے انداز میں جواب دیا۔

"اور چوکلیٹ ——؟"

"چوکلیٹ تو تمھاری جیب میں ہیں انھیں ختم کر لو۔ پھر اور خرید لیں گے۔"

اور خریدنے کی بات سُن کر بچّے نے منھ میں ایک کے بجائے دو چوکلیٹ ٹھونس لیے۔ بچّے کی اس حرکت پر باپ کے ہونٹوں پر دبی دبی سی مُسکراہٹ رینگ گئی۔ گو وہ گھر سے باہر نکلتے وقت بےحد آزردہ تھا لیکن اپنے بچّے کے اصرار پر وہ انکار کیے بغیر اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔

"بابا رکشا کیوں نہیں لیتے۔ میرے پاؤں دکھ رہے ہیں۔"

"پیدل چلتے رہو گے تو تمھیں احساس ہوگا کہ زندگی کیا ہے۔ ابھی تو تم ایک فرلانگ بھی

نہیں چلے ہو۔۔"

بچے کو باپ کی فلسفیانہ باتیں سمجھ میں نہیں آئیں۔ وہ پھر رکشا کا اصرار کرنے لگا۔

" واپسی میں لے لیں گے۔" باپ نے دُلار سے کہا

" آپ کیا ہر چیز واپسی ہی میں لیتے ہیں۔" بچے کے اس تیکھے سوال نے اُسے چونکا دیا۔ اُسے ایک دھچکا سا لگا۔ وہ چُپ ہو کر رہ گیا۔

اپنے بچے کے ساتھ تھوڑی دیر باہر گھومنے کی خواہش پر اب مُردنی سی چھا گئی تھی۔ اُسے سڑک پر چلنے والے سارے لوگ پریشان زدہ لگ رہے تھے۔

" بابا آپ کے چہرے پر پسینہ آ گیا ہے۔ اسے رومال سے پونچھ ڈالیے۔"

" تم ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیوں غور کرتے ہو۔ چُپ چاپ میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے۔"

اس کے لہجے میں درشتگی تھی۔

باپ کے درشت لہجے میں ملائمت کو نہ پا کر بچہ سہم کر چُپ چاپ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

بچے نے سوچا۔ اگر اُس نے باپ کی بات نہیں مانی تو چوکلیٹ اور گیس کے خوبصورت غبارے سے بھی محروم ہو جائے گا۔

گو ان دونوں نے ابھی کوئی لمبا فاصلہ طے نہیں کیا تھا۔ لیکن ایک چھ سات برس کے بچے سے یہ کس طرح توقع رکھی جا سکتی تھی کہ وہ زیادہ دور پیدل چلے۔

اب بچے کی نگاہیں شوکیس میں رکھے ہوئے کئی خوب صورت کھلونوں پر گئیں۔ پٹڑیوں پر بھاگتی ہوئی ٹرین ۔۔۔ جاپانی موٹر ۔۔۔ ڈرم پیٹتا ہوا بندر ۔۔۔ اُس سے رہا نہ گیا۔

"بابا وہ ڈرم پیٹتا ہوا ———"

"نہیں نہیں ——— ابھی نہیں —— وہ واپسی میں لے لیں گے۔"

باپ کو پھر ایک بار دھچکا سا لگا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ اور وہ ان موتیوں کو بڑی احتیاط سے رومال میں جذب کر کے آگے بڑھ گیا۔

بچہ اب اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر اور بھی لوگ چل رہے تھے۔

شام ابھی ابھی شروع ہوئی تھی۔ دکانوں کی پیشانیاں برقی قمقموں کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ بس ٹرک پر نئے موڈل کی کاروں کا ایک جال سا پھیل گیا تھا۔ اور فٹ پاتھ پر لوگ نپے تلے قدم ڈالے آگے بڑھ رہے تھے۔

سڑک کے اس پار چند بچے آئس فروٹ کھا رہے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ اپنے باپ سے کہے کہ وہ کم از کم آئس فروٹ ہی دلا دے۔ لیکن وہ سہما سہما اپنے باپ کے ساتھ چل رہا تھا۔

وہ فٹ پاتھ جس کی بیمار اور تنگ زمیں پر وہ دونوں چل رہے تھے۔ وہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ پھر اچانک کسی نے بچے کو ایک دھکا دیا۔ بچہ گرتے گرتے بچ گیا۔

"دیکھ کر چلا نہیں جاتا ———" بچے نے احتجاج کیا۔ دھکا دینے والے آدمی نے اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے وہ دل ہی دل میں اس سے معذرت چاہ رہا ہو۔

باپ چپ چاپ اس طرح چل رہا تھا جیسے اسے کسی چیز کی حاجت ہی نہ ہو۔ یوں بھی اس نے اپنی آنکھوں پر ایک پٹی باندھ رکھی تھی۔

"اس آدمی نے مجھے دھکا دیا اور آپ نے کچھ بھی نہ کہا بابا" ——— لڑکے نے احتجاج کیا۔

"میں نے دیکھا نہیں ———"

"آپ ہی نے تو مجھے ———

"اب چُپ بھی رہو۔ تھوڑی دیر میں ہمیں گھر واپس لوٹنا ہے"۔

واپسی کے تصور ہی سے بچے کے چہرے پر مسرت کی آڑی ترچھی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ وہ خیال ہی خیال میں اُن سارے کھلونوں کو سمیٹنے لگا جو پیچھے جاتی ہوئی دکانوں کے شوکیس میں سجے ہوئے تھے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے گیس غبارے بیچنے والا وہ لڑکا کھڑا تھا جس کی چھتری میں قسم قسم کے خوب صورت گیس غبارے ہوا میں لہرا رہے تھے۔

اس نے اس نظارے سے محظوظ ہونے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی جیب چوکلیٹ سے خالی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو۔ تھوڑی دیر میں ہمیں لوٹنا ہی ہے۔ جیب کو بار بار کیوں ٹٹول رہے ہو"

"بابا چوکلیٹ ختم ہو گئے"

"تم نے ایک گھنٹے میں پانچ چوکلیٹ کھا لیے"

بچے کو باپ کا یہ حساب کتاب اچھا نہیں لگا۔ وہ اداس ہو کر رہ گیا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے اب چوکلیٹ بھی ناپ تول کی نذر ہو رہے ہوں۔

"بابا سچ پوچھیے تو آپ نے مجھے صرف چار ہی چوکلیٹ دلوائے تھے"۔ بچے نے جی کڑا کر کے کہا۔

"بکو مت۔ میں نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ ٹھیک ہے۔ اب اس کی پیشانی پر پسینے کے کئی قطرے نمایاں ہو گئے تھے۔ لیکن اس بار بچے نے اس سے یہ نہیں کہا کہ بابا پیشانی پر پسینہ چمک رہا ہے اسے رومال سے پونچھ ڈالیے۔

لیکن اس کے باپ نے پتلون سے اس طرح رومال نکالا جیسے وہ رومال بھی اُس کا اپنا نہ ہو۔ وہ کچھ سوچتا ہوا یونہی سڑک پر کھڑا ہو گیا۔

بچے کے قدم بھی جیسے زمین سے چمٹ کر رہ گئے۔

وہ جو تھوڑی دیر پہلے سڑک پر مووی فلم چل رہی تھی، اس کے دو کردار اب جیسے گونگے ہو چکے تھے۔ باپ کے چہرے پر شدید کرب کی کیفیت عیاں تھی اور بچہ اپنے باپ کو اس عالم میں دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ آیا کبھی ہم واپس بھی لوٹ سکیں گے۔

فٹ پاتھ کے عین سامنے سیمنٹ کا بنا ہوا ایک چبوترا تھا جس پر بیڑی کا دھواں اڑاتے ہوئے دو آدمی بیٹھے گپ بازی کر رہے تھے۔ چبوترا کچھ اتنا وسیع تھا کہ ابھی اس میں کئی اور آدمی سما سکتے تھے۔ وہ کچھ دیر آرام کرنے کے لیئے بچے کا ہاتھ تھامے چبوترے پر آ بیٹھا۔ گپ بازی کرنے والے اِن دو آدمیوں نے ایک لمحے کے لیے دزدیدہ نگاہوں سے انھیں دیکھا اور پھر ایک بار اپنی لایعنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔

بیڑی کا گاڑھا اور تلخ دھواں جب بچے کی ناک سے ہوتا ہوا منھ میں آ گھسا تو اُسے یک بارگی کھانسی آگئی۔

"یہ جگہ خراب ہے بابا ـــــ" بچّے نے دبے دبے انداز میں احتجاج کیا۔

"کوئی جگہ خراب نہیں ہوتی ـــــ خاموش رہو ـــــ" باپ نے ترش لہجے میں کہا۔

دفعتًا ان دو آدمیوں میں سے ایک نے اپنی بیڑی بجھائی اور دوسرے نے ایک لمبا کش لے کر اُسے پاؤں تلے روند دیا ـــــ جب وہ دونوں اُٹھ کر جانے لگے تو بچّے کے باپ نے نرم لہجے میں کہا۔

"آپ لوگ یہاں بیٹھئے نا۔ ہماری موجودگی سے کہیں آپ کو تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے ـــــ"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم بھی یہاں تھکن دور کرنے کے لیے ہی بیٹھ گئے تھے۔

اب تو بیڑیاں بھی ختم ہو گئیں"۔

جب وہ دونوں جا چکے تو باپ نے بیٹے کی طرف چہرہ گھماتے ہوئے کہا۔

دیکھا وہ تمہاری بات کا بُرا مان گئے اور چلے گئے"۔

بچے نے ٹکر ٹکر اپنے باپ کے چہرے کو دیکھا۔ اب پسینہ کاجل کی لکیر کی طرح اس کے گالوں پر پھیل چکا تھا۔ اس کا جی پھر ایک بار چاہا کہ اپنے باپ سے کہے کہ وہ اپنے چہرے سے پسینہ پونچھ لے لیکن اس کی زبان پر جیسے تالے پڑ چکے تھے۔

باپ نے سوچا۔ اب نوید اس سے یہ کیوں نہیں کہتا کہ رومال سے اپنا چہرہ صاف کر لیجیے۔

شاید محبت نے احتجاج کا روپ دھار لیا ہو۔

اس نے کتنے غم اپنے سینے میں پال رکھے تھے۔ وہ احتجاج کرتا بھی تو کس سے ۔۔۔ اب تو اس میں اپنے آپ سے لڑنے کی طاقت بھی باقی نہ رہی تھی۔

وہ اب لمحوں کی گرفت میں تھا اور ہوائیں سائیں سائیں چل رہی تھیں۔ یہ بے موسم کی ہوائیں اسے بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔

کچھ دیر یوں ہی خاموش رہنے کے بعد اس نے بچے سے کہا۔ "بیٹے اب ہمیں گھر واپس چلنا ہے۔" لیکن بچے نے باپ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

پھانس

ایک طویل مدت کے بعد جب اچانک اُس سے میری مڈبھیڑ ہوگئی تو وہ مجھے کافی نڈھال اور مردم گزیدہ سا لگا۔ اس کے موٹے موٹے خشک ہونٹوں کی محراب سے اُس کے ملگجے دانت یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ دانت نہ ہوں سیتا پھل کے بیج ہوں۔

میں نے اس کی ذات میں دلچسپی لینا مناسب نہیں سمجھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ حتمی طور پر میری مدد کا محتاج ہو۔ تاہم وہ ساری پچھلی باتیں اور یادیں لگ بھگ بھلا چکا تھا۔ بھولنا اور بھلا دینا شاید اس کی کمزوری تھی۔

آج میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی ویرانی دیکھی ایک ایسی ویرانی جو الفاظ کے کئی حصاروں کو توڑ سکتی ہے۔ لیکن گرفت میں نہیں آتی۔ میں جلدی میں تھا شاید میں جلدی میں نہیں تھا ـــــ

پھر وہ کونسا جذبہ تھا جس نے مجھے نہ آگے بڑھنے کی اجازت دی اور نہ پیچھے ہٹنے کی۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ آئندہ پھر کبھی ہم فرصت سے ملاقات کر سکیں۔"

"نہیں ـــ نہیں جو بات بھی ہوگی آج ہی ہوگی اس کے بعد پھر کبھی نہ ہوگی۔ میرا گھر زیادہ دور نہیں کچھ مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے یار نہ رہی کے سامنے اس کا ذکر کر سکتا ہے۔"

"تم عمارت کی بنیادیں غلط پتھر رکھ رہے ہو۔ تمہیں یقین ہے کہ میں تمہارے مسائل میں

دلچسپی دکھاؤں گا۔"

"یقین ہے اور ساتھ ساتھ اعتماد ــــ اور بھرپور اعتماد ــــ"

"یقین اور اعتماد میری نظر میں بڑے بودے لفظ ہیں۔"

ٹریفک کے شور میں میری باتیں شاید وہ سُن نہیں پا رہا تھا اور اپنی ہی ہانکے جارہا تھا۔

"اچھا ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ کوئی گوشۂ تنہائی تلاش کریں اور وہاں بیٹھ کر ......

دراصل ان بھاگتے دوڑتے چہروں کو دیکھتے دیکھتے میں اُوب سا گیا ہوں۔ وہی سڑکیں۔ وہی ہوٹلیں وہی لوگ لیکن مدتوں بعد تمھارے چہرے کی زیارت نصیب ہوئی ہے تو میں سوچ رہا ہوں کہ کچھ دیر دید کا بادہ اٹھاؤں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اُداسی کا ایک نوحہ بن گیا۔ میں نہ چاہنے کے باوجود اُس کے ساتھ ہولیا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اس کا گھر اُس کی حیثیت سے کہیں زیادہ بلند و بالا تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اسی کا گھر ہے۔ سرونٹس کواٹرس سے گزرتے ہوئے سلام کے لیے اُٹھتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر میں ویسے بھی دم بخود تھا لیکن اس کے چہرے پر اطمینان کی لہریں ہویدا تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اس نے اپنی یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے۔

"کیا بھابی گھر میں نہیں ہے ــ؟"

"کس کی بھابی تمھاری یا میری ــ؟"

اس جواب کے بعد مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ مزید میں اس سے کوئی اور سوال کر سکتا ـــ

"چائے پیو گے ـــــ یا ڈرنکس لوگے ــــ؟"

"چائے ہی ٹھیک رہے گی۔"

"ہم اپنی مرضی کبھی کسی پر نہیں ٹھونستا۔ تم نے چائے کے علاوہ زہر کی بھی فرمائش کی

ہوتی تو میں خوشی خوشی زہر کا پیالہ تمھارے ہاتھ میں تھما دیتا تمھیں مرتا ہوا دیکھ کر اطمینان محسوس کرتا کہ کہیں تو میرا وجود کسی کے کام آیا۔ در اصل میں یہاں تمھیں اس لیے لایا تھا کہ اپنے بارے میں تم سے کچھ کہہ سکوں۔ کئی دنوں سے میرے ذہن پر ایک بوجھ ہے۔ میرا ذہن وسوسوں، اندیشوں اور خوف کے بے نام سایوں سے اس طرح گھرا ہوا ہے کہ کبھی کبھی خود میرا وجود کانپ جاتا ہے۔ میں ان دنوں بڑے پیچیدہ مسائل سے گزر رہا ہوں ـــــ"

وہ اپنے ہر تیسرے جملے کے بعد اسی بات کو دُھراتا رہا کہ مسائل بے حد پیچیدہ ہیں اور نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ چھٹکارے کی کوئی سبیل نہیں۔ وہ یہ کہتے کہتے روہانسا ہو گیا اور ہانپنے لگا۔

وقت رینگ رہا تھا۔ لیکن رازوں میں ڈھکے کہانی کے انجام سے میں ہنوز ناواقف تھا۔ میں کوشش کے باوجود اس کی دلجوئی نہ کر سکا۔ اب میرے لیے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا لیکن میرے مسائل اس سے مختلف تھے۔ وہ سخت ذہنی اُلجھنوں اور اعصابی کیفیت سے دوچار تھا اور سزا میں بھگت رہا تھا۔ گھڑی کا ہر سیکنڈ، ہر منٹ مجھے پہاڑ کی طرح لگ رہا تھا۔

"میرا انجام دیکھ رہے ہو؟" اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم مجھے اپنے ہاتھ کی ریکھائیں بتانا چاہتے ہو۔"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں کہ خود میرے ہاتھ میں دھن ریکھا بھی ہے اور رنگ آف سولومن بھی ـــــ"

"تو تم آخر چاہتے کیا ہو ـــــ"

"میری گھڑی کی طرف دیکھو ـــــ" اس کا سانس پھول رہا تھا اور پیشانی پر پسینے کے

باریک باریک قطرے نمایاں انداز میں دکھائی دے رہے تھے اس نے اپنے ہونٹوں میں دانت اس طرح گاڑ رکھے تھے جیسے کوئی خوف کے تصور سے ہراساں ہو۔

"تمہاری گھڑی تو برابر چل رہی ہے۔"

"نہیں ـــ سیکنڈ کا کانٹا گھوم نہیں رہا ہے۔ غور سے دیکھو ـــ"

لیکن میں بجائے گھڑی کے اس کے چہرے کو حیرانی سے دیکھتا رہا۔

اُس نے کہا "میری موجودہ زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہو کر رہ گئی ہے۔"

"میرے سارے پیچیدہ مسائل اسی گھڑی کے گرد گھوم رہے ہیں اور میں بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہوں۔"

میں اس کی عجیب و غریب باتوں سے عاجز آچکا تھا۔ چاہتا تھا کہ گھر سے نکل بھاگوں اس نے اچانک خاموشی اختیار کرلی۔ اِس کا دبلا پتلا سینہ طوفانی سمندر کے مدوجزر کی طرح کانپ رہا تھا، جیسے وہ مدت سے بیمار ہو۔

"میں اب چل رہا ہوں۔ رات کافی بیت چکی ہے۔ سُن رہے ہو" مگر اُس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اب بھی وقت ہے کسی بھی چیز کو پوشیدہ رکھے بغیر وہ سب کچھ کہہ ڈالو جو تمہارے دِل میں ہے۔ سُن رہے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں تم سے مِل کر تمہاری بے سروپا باتوں کو سُن کر ادھ مُوا سا ہو کر رہ گیا ہوں۔ پتہ نہیں وہ کونسی گھڑی تھی جو میری تم سے ملاقات ہوگئی۔ مجھے ذرا بھی گمان ہوتا کہ تم سے ملنے کے بعد.......

میں نے ابھی اپنا جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ اچانک ایک خطرناک قسم کی ابابیل کمرے میں داخل ہوئی اور پے در پے کمرے کے چکر لگانے شروع کر دیے۔

اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے ایسا لگتا تھا۔ جیسے اُس پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔

میرا دل خوف اور وحشت سے بے طرح کانپ رہا تھا۔ لیکن وہ مطمئن تھا جیسے اس کے لیے یہ روز کا معمول ہو۔

"گھبراؤ نہیں ــــ یہ تمہیں ضرر نہیں پہنچائے گی۔ یہ ابابیل یہاں روز آتی ہے۔ اور اپنے مقررہ چکر کاٹنے کے بعد یوں ہی چلی جاتی ہے۔ مگر دیر سے آئی ہے نا تو چکر بھی اسی تیزی سے لگا رہی ہے۔ لو اب وہ چلی گئی ــــ"

واقعی ابابیل کمرے سے جا چکی تھی۔

وہ اضطراری کیفیت جو اچانک ابابیل کے آجانے سے مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ وہ اب آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اب بھی خاموشی کا لبادہ اوڑھے میری جانب عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔

"اب بھی وقت ہے' وہ ساری باتیں کہہ ڈالو۔ جس کے لیے مجھے تم یہاں گھسیٹ لائے تھے۔ سن رہے ہو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں" لیکن وہ پھر بھی چپ تھا۔ بت کی طرح خاموش اور قبر کی طرح پُر سکون۔

میں بڑی مایوسی کے عالم میں اس کے گھر سے باہر نکل آیا۔ ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں اور سڑک پر دور دور تک ہولناک سناٹا طاری تھا۔ اکا دکا لوگ بارش میں بھیگتے ہوئے سڑک پار کر رہے تھے۔ میں بارش سے بچنے کے لیے ایک سائبان کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔

وہاں کافی اندھیرا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ دو تین اور لوگ بھی یہاں کھڑے ہیں۔

کسی نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا بجا ہوگا ——؟"

"گھڑی بند ہے ——" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"تعجب ہے۔؟ وہ تو چل رہی ہے۔"

"لیکن سیکنڈ کا کانٹا ——؟"
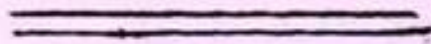
لاعلاج

آج وہ سر سے پاؤں تک کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ اُس نے کھڑے کھڑے لانڈری کے بڑے شیشے میں اپنے چہرے کو دیکھا۔

صبح جب وہ گھر سے نکلا تھا تو بڑا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ لیکن اب اسے اپنے بھیگے ہوئے لباس کو دیکھ کر کوفت سی ہو رہی تھی گو اب مطلع صاف ہو چکا تھا۔ تاہم آسمان کے شمالی سرے پر بادلوں کے قافلے قطار در قطار تیزی سے دوڑ رہے تھے وہ ڈرائی کلیننگ شاپ کے چھجّے کے نیچے دبکا ہوا کھڑا تھا۔

وہ سوچنے لگا اُس نے یہاں محبّت کے لیے جھولی پھیلائی اور لوگوں نے اسے دکھ اور اداسیوں سے بھر دیا۔ اس نے یہاں محبت سے آواز دی اور لوگوں نے اپنے کان بند کر لیے۔

ایک ہاتھ سے ہمدردی اور دوسرے ہاتھ سے ......

"کیا بجا ہوگا" کسی نے قریب سے آواز دی۔

"گھڑی دیکھ لیجیے" اُس نے جھلّا کر جواب دیا۔

اب اس کے سامنے ایک سانولا سلونا اونچے قد کا نوجوان نکھرے ستھرے

لباس میں ملبوس اُسے نیچے سے اُوپر تک دیکھ رہا تھا۔

وہ اسے بیک نظر اچھا آدمی لگا۔ لیکن جب اس کی نگاہ اس کی کلائی پر گئی جہاں گھڑی بندھی ہوئی تھی تو اُسے حیرت ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے اُسے احساس ہوا کہ کہیں کسی اور آدمی نے تو اس سے ٹائم نہیں پوچھا تھا۔ جس جگہ وہ کھڑا تھا۔ وہاں اور بھی لوگ ٹیکسیاں ہانکتے کھڑے تھے جنھیں رخصت کرتے ہوئے اُس نے دیکھا بھی تھا۔ وہاں ایک آدمی ضرور باقی رہ گیا تھا جس کی پُشت اس کے چہرے کے مقابل تھی۔

"کیا تھوڑی دیر پہلے آپ ہی نے ٹائم پوچھا تھا؟"

"جی ہاں" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کے ہاتھ پر بھی تو گھڑی چمک رہی ہے۔ کیا وہ وقت نہیں بتلایا کرتی۔ یا آپ نے مخاطب ہونے کا بہانہ تراشا ہے۔"

اس کے اس سوال پر اجنبی کی پیشانی پر برہمی کی ایک لکیر بھی نمودار نہیں ہوئی۔ بلکہ اس نے اطمینان سے کہا وہ اس مداخلت کے لیے معذرت خواہ ہے۔ دراصل گھڑی چلتی چلتی رُک گئی تھی اس لیے...... اس نے اپنے جملے کو ادھورا سا چھوڑ دیا۔

"اگر میں آپ کو ٹائم بتا بھی دوں تو بھی آپ کو کسی اچھے گھڑی ساز کے پاس جانا ہی ہوگا۔"

اس نے بات بڑھائی۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ آپ سے ٹائم ملانے کے بعد مجھے کسی اور گھڑی سے

ٹائم ملانا ہی پڑے گا۔"

اسے احساس ہوا جیسے اس نے گھڑی کے ساتھ اس کی بھی ہتک کی ہو۔ اس نے حقارت سے پھر ایک بار اس پر نگاہ ڈالی۔ صورت شکل سے تو وہ خاصا شریف معلوم ہوتا تھا ۔۔ لیکن شرافت پیشانی پر لکھی تھوڑی ہی ہوتی ہے۔

اس نے دیکھا وہ سفید پوش نوجوان دور خلاؤں میں جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ اس کے متعلق سوچ رہا ہو۔۔ یہ محض اس کا شُبہ تھا جو صحیح نکلا۔

اس نے ذرا سا چونک کر کہا۔ اگر آدمی ہر ایک سے محبت کرنا سیکھ لے تو زندگی کی کوئی منزل دشوار نہیں ۔۔۔ میرا خیال ہے آپ اپنی موجودہ زندگی سے نالاں ہیں۔ اس لیے طبیعت میں کبیدگی اور چڑچڑاہٹ دبے پاؤں داخل ہوگئی ہے۔ آدمی اگر چاہے تو دُکھ کی کوکھ سے جنم لینے والے اداس ماحول کو بھی خوشی اور مسرت میں تبدیل کر سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اجنبی آہستہ آہستہ چلتا ہوا سڑک پر پھیلے ہوئے ہجوم میں کہیں کھو گیا۔ اور وہ بغیر کسی ردِّ عمل کے بڑے بازار سے لگے ایک ہوٹل میں داخل ہوگیا۔

اِس نے وقفے وقفے سے چائے کے لگاتار چار کپ پیئے۔ چائے کا چوتھا کپ لاتے ہوئے بیرے نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ بل ادا کئے بغیر بھاگ جانے والے لوگوں میں سے ایک ہو۔ اس نے جیب سے دو روپے کا نوٹ نکالا اور بیرے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "اسے تم رکھ لو۔"

بیرا بھونچکا سا رہ گیا۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ مسلسل چار کپ پینے والا ایک بے ڈھنگا سا انسان بھی اسے دو روپے ٹپ دے سکتا ہے۔

اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ کے بعد دوسرا سگریٹ سلگانا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے احساس ہو گیا کہ وہ اب تک ضرورت سے زیادہ سگریٹ پھونک چکا ہے۔

اب اس نے طے کر لیا کہ وہ کل سے سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ لیکن رات دیر گئے جب وہ بستر پہ آکر لیٹا تو اُسے تھکن کا شدید احساس ہوا۔ اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا جیسے کسی نے کوئی بڑا شہتیر اس کے جسم پہ ڈال دیا ہو۔ پھر اسے اچانک احساس ہوا جیسے دروازے پر کوئی ہولے ہولے دستک دے رہا ہو۔ اتنی رات گئے بھلا کون آئے گا؟ یہ سراسر اس کا وہم ہے —— وہ ذہنی خلفشار میں مبتلا ہے۔ اُسے آرام کی ضرورت ہے۔ وہ شدید اعصابی تناؤ میں مبتلا ہو چکا ہے۔

وہ بمشکل اپنے جسم کو گھسیٹ کر دروازے تک لایا۔ باہر ایک خارش زدہ کُتّا اپنے زخم چاٹ رہا تھا وہ دوبارہ بستر پر گر پڑا۔

لیکن روز کی طرح کل بھی اسے صبح کا سامنا کرنا ہو گا۔ صبح کے بعد شام اور رات کے بعد پھر صبح یہ شب و روز کا چکّر کب تک چلتا رہے گا۔

وہ سوچنے لگا۔ مگر جب صبح کی سپیدی نمودار ہوی تو وہ اٹھ کر باہر آگیا۔ وہ اپنے گھر سے کب بھاگا تھا۔ اس کا در اصل گھر تھا بھی یا نہیں؟ اس کے ذہن سے یہ سارے نقش مٹ چکے تھے۔

اب وہ اس شہر کی کسی نہ کسی قیام گاہ ہی کو اپنا گھر سمجھنے لگا تھا —— گھر کتنا پیارا لفظ ہے اور کتنا زہریلا!!

کہنے کو تو صبح ہو چکی تھی لیکن موسم کی خرابی کے سبب آسمان پر ایک غبار سا چھا گیا تھا اس بوجھل اور دھواں دھواں سی فضا نے اسے اور بھی اُداس بنا دیا۔

راہ چلتے چلتے اُسے سامنے وہی ہوٹل دکھائی دیا جہاں کبھی وقت اس نے پے در پے چائے کے چار کپ پیئے تھے۔ اس نے جوں ہی ہوٹل میں قدم رکھا تو بیرے نے اُسے جھک کر سلام کیا۔ اس نے بیرے کے چہرے کو دیکھا۔ اسے محسوس ہوا۔ جیسے بیرے کی پیشانی پر ٹپ کی شکل میں دیا ہوا وہ نوٹ ابھی تک تھرک رہا ہو۔ اس نے چائے کا آرڈر دیا اور سوچنے لگا کہ اس کی جیب میں اب صرف چند نوٹ اور سکّے باقی رہ گئے ہیں۔

آج خلافِ معمول ہوٹل میں بہت ہی کم لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ قریب ہی میں ایک بوڑھا بیدکی کرسی میں دھنسا ہوا چائے کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیل رہا تھا۔ پچھلی جانب چھدری سی داڑھی والے دو نوجوان آپس میں زور زور سے یوں باتیں کر رہے تھے۔ جیسے وہ کسی بات پر جھگڑ رہے ہوں مزید کوفت سے بچنے کے لیے وہ ہوٹل سے باہر آگیا۔

سڑک لوگوں کے ہجوم سے اٹی ہوئی تھی لگتا تھا جیسے ہر آدمی ایک دوسرے کے تعاقب میں سرگرداں ہے۔

مدتوں بعد آج اچانک جب وہ اپنے دوست کے گھر پھر گیا تو وہی کہنہ اور کریہہ آواز آئی۔

"تمہارا میرے گھر آکر اس طرح مدد طلب کرنا کیا یہ سچائی کی شکست نہیں۔ سچائی اور شرافت تو جنگلوں اور بیابانوں میں اُگتی ہے وہاں کسی دوست کو آواز دو

شاید وہ تمھارا ہاتھ تھام لے کیوں کہ میرے کاروان میں تمھارے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

ہوائیں ایک بار پھر چیخیں اس نے بڑی تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ اس طرح رکھ لیے جیسے وہ گزرے ہوئے سارے زہریلے لمحوں کو یک لخت بھلا دینا چاہتا ہو۔

اب اس کے سینے میں ایک عجیب سا طوفان بپا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ اب وہ یہ شہر بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گا۔

کسی اور شہر میں جا بسے گا ـــــ ایک اجنبی شہر میں۔

مگر یہ شہر بھی تو ـــــ؟

وہ منھ ہی منھ میں بڑبڑانے لگا۔ یک بارگی اسے احساس ہوا جیسے کوئی دبے پاؤں اس کا پیچھا کر رہا ہو ـــــ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اُسے حیرانی ہوئی کہ اس کے پیچھے چلنے والا وہی خارش زدہ کُتا تھا!!

بند دروازہ

"صورت شکل سے بڑے دکھی اور مغموم لگ رہے ہو۔ لگتا ہے شادی شدہ ہو۔"

پہلی ملاقات ہی میں اس کا پھینکا ہوا طنز بھرا تیر عین نشانے پر جا لگا۔ اپنی بیوی کی سادی کوتاہیاں ایک ایک کرکے اس کے ذہن پر ضربیں لگانے لگیں۔ اُسے احساس ہوا کہ یہ لڑکی جو بظاہر ایک معمولی ٹائپسٹ ہے زندگی کے بارے میں ایک گہرا مشاہدہ رکھتی ہے اگر وہ اسی طرح باتیں کرتی رہے گی تو شاید وہ اس سے بھی بور ہو جائے گا۔ بالکل اپنی بیوی کی طرح۔

دراصل وہ اس فرم میں اپنے ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ ضمنی طور پر ایک ایپلی کیشن (APPLICATION) بھی اسے ٹائپ کروانی تھی۔ وہ ایپلی کیشن کہیں اور بھی ٹائپ کروا سکتا تھا لیکن اس کا ساتھی اسے یہاں گھسیٹ لایا اور خود اپنے کاموں میں جُٹ گیا۔

ٹائپ کرنے سے پہلے اس نے ایپلی کیشن کا اس طرح جائزہ لیا جیسے اس کا تعلق راست اس کی ذات سے ہو۔ اس کے چہرے پر آئی ہوئی سنجیدگی کی گہری لکیروں کو پڑھتے ہوئے اسے اندازہ ہوا کہ وہ میٹر (MATTER) میں کچھ تبدیلی کی خواہاں ہے اس کا اندازہ صحیح نکلا۔ "درخواست میں جو نرمی اور اخلاق کا مظاہرہ ہونا چاہیئے وہ اس ایپلی کیشن میں سرے سے مفقود ہے۔

"ایسا کب اور کیوں ہوتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔"

اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر وہ بوکھلا سی گئی۔

"میں نے آپ سے کچھ پوچھا تھا۔"

"ضروری نہیں کہ آدمی ہر سوال کا جواب دے۔ معاف کیجئے گا محترمہ ـــ"

"دیکھیے مجھے لفظ محترمہ سے سخت چڑ ہے۔ میرا نام ہے۔ خیر جانے دیجیے۔ نام میں کیا دھرا ہے۔"

اپنا نام اس کے ہونٹوں کے کنارے پر آکر رک سا گیا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کی نگاہیں اٹنڈنس رجسٹر پر آکر جم سی گئیں۔ اس نے بڑی احتیاط سے ٹائپ کی ہوئی دو فائلیں رجسٹر کے اوپر اس طرح پھینک دیں جیسے یہ عمل اس کا روز کا معمول ہو۔

اس کی دی ہوئی اپلی کیشن پر پیپر ویٹ رکھتے ہوئے اس نے پوچھا "آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ آپ تبدیلی کے حق میں ہیں یا جلی بجھی چنگاریوں کا منظر اسی انداز میں برقرار رہے جس انداز میں آپ نے لکھا ہے۔"

"جلی بجھی چنگاریوں کا منظر اسی انداز میں برقرار رہے یا نہیں، لیکن لفظ نہیں ہمیشہ "ہاں" کے پیچھے ہاتھ جوڑے ہوئے چلتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ ہر "ہاں" کی چتا پر ہر دو نہ ایک "نہیں" کی بھینٹ چڑھتی ہے۔"

"تو پھر "ہاں" اور "نہیں" کے پل صراط پر چلنے سے پہلے سوچ لیجیے کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں لنچ کر لوں۔ آپ بھی چاہیں تو ساتھ دے سکتے ہیں۔"

"لنچ تو مجھے اپنے دوست کے ساتھ کرنا ہے بس وہ اب آتا ہی ہوگا ـــ"

"دوست کتنا پیارا لفظ ہے۔ ہے نا۔"

"ہے نا" پر اس نے کچھ اس طرح زور دیا کہ وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا ہی رہ گیا اور جب وہ نپے تلے قدم ڈالتی ہوئی باہر چلی گئی تو اسے احساس ہوا کہ اسے یوں دیکھنا نہیں چاہیے تھا۔ لیکن اسے حیرت اس بات پر تھی کہ اس کی بیوی بھی کبھی کبھار اسی طرح ——۔

"کیا سوچ رہے ہو یار بڑی بور لڑکی ہے وہ — اس لیے یہاں وہ (UN POPULOR) ہے دو برس میں اس نے یہاں کسی کو بھی اپنا دوست نہیں بنایا۔ اب اس سے اُس کے مزاج کا اندازہ لگا ہو۔"

"ہم کبھی کبھار چھوٹا موٹا کام اس سے لے لیتے ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ تم بڑی دیر تک وہیں چپکے رہے۔ خیر اپلی کیشن تو ٹائپ کروالی ہے نا —"

"یار چھوڑو۔ ان باتوں کو۔ پہلے ہوٹل چل کر کھانا کھالیں، بھوک بہت لگ رہی ہے۔"

جب وہ ہوٹل پہنچے تو سارے کیبنوں پر لوگ قبضہ کیے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ انتظار میں باہر ہی کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے چہیتے بیرے کو قریب بلا کر کہا "اس کونے والے کیبن پر ہم حملہ کرنا چاہتے ہیں، صرف تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ دو ایک کٹورے اور چند پلیٹیں ہی ٹوٹیں گی۔"

"کوئی بات نہیں جی" کہہ کر بیرا اپنی سروس میں لگ گیا۔

ٹیبل پہ کچھ نچڑی ہوئی ہڈیاں اور مرغ کی دو ایک ٹانگیں دھری ہوئی تھیں۔ ساگ ادھر اُدھر پھیلا ہوا تھا۔

طشتری میں رکھے ہوئے سلاد کو شاید جانے والے گاہک نے چھوا تک نہیں تھا۔

"آج کل کھانا بھی اطمینان اور سکون سے کھایا نہیں جاتا۔ ہر جگہ ہجوم، ہر جگہ ایک

بے اطمینانی اور انتشار کی سی کیفیت۔ پانے سے زیادہ کھونے کا احساس، کھونے سے زیادہ۔۔

"بابو جی کل والی ڈِش ۔۔؟"

"ہاں ہاں وہی ۔"

"یار تم بالکل اسی بور لڑکی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہو۔ وہ بھی اسی طرح بہکی بہکی باتیں کرتی ہے۔ ایک دن کہہ رہی تھی۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم سب لوگ ایک پُل صراط پر چل رہے ہیں ایک کے پیچھے ایک۔"

"میڈم کیا اس قافلے میں کہیں آپ نے مجھے بھی دیکھا تھا؟" میرے اس سوال پر سنجیدگی سے اس نے کہا۔

"سب کے چہرے ایک جیسے ہوں تو کون کس کو پہچانتا ہے۔ شاید آپ بھی وہاں رہے ہوں۔ شاید نہ بھی ہوں، فرق کیا پڑتا ہے؟" ایک واقعہ ہو تو بیان کروں، بہرحال اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ ایک دفعہ آفس ہی میں وہ اپنا منی پرس بھول گئی دوسرے دن جب میں نے پرس لوٹانے کی کوشش کی تو اس نے بے ساختہ کہا "میں کسی بھی گم شدہ شے کو پاکر خوش نہیں رہ سکتی۔ اس لیے یہ منی پرس آپ ہی کا ہے۔"

جانتے ہو۔ اس میں کتنے روپے تھے۔؟

ایک دو نہیں پورے آٹھ سو۔" اس کے اپنے خود ساختہ چند اُصول ہیں۔ ان ہی اُصولوں پر وہ بھینٹ چڑھ رہی ہے۔"

"یار بارش شروع ہو گئی۔"

"یہاں کی بارش کا کوئی ٹھکانا نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں آفس نہ پہنچ پاؤں اور پانچ بج جائیں ۔"

"چار تو بج ہی چکے ہیں۔"

"بے موسم کی بارش جس زور و شور سے شروع ہوتی ہے اِسی طرح جلد ختم بھی ہو جاتی ہے۔"

"خیر یہ بھی ٹھیک ہے۔ آج مینجر بھی تو نہیں ہے۔ کل آجائے گا تو وہی بور یت شروع ہو جائے گی۔"

پتہ نہیں میری باتوں پر آج تم دھیان کیوں نہیں دے رہے ہو۔ بس میں بکے جارہا ہوں اور تم سُنے جارہے ہو۔ لگتا ہے۔ گمبھیر موڈ میں ہو۔ بِل تو تمھارا پاس ہو ہی جائے گا۔ میرے یہاں دو سو روپے بیکار پڑے ہیں تم جس وقت چاہو مجھ سے لے سکتے ہو۔

ارے تم نے اچانک بِل کیوں PAY کر دیا۔ اصولاً یہ بل مجھے PAY کرنا چاہیے تھا۔ یار بڑے جلد باز ہو۔ شرافت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ویسے پیسوں کا آفر اپنی جگہ ہے۔ کہو تو کل ہی اپنے ساتھ پیسے لیتا آؤں۔ پے منٹ کی مجھے ایسی کوئی خاص فکر نہیں ہے۔ وہ تو تم دے ہی دو گے ــــ بس تمھارا ہاں مجھے بِل جائے۔ یار بارش ختم ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانچ بھی بج گئے۔ چلو آفس چلتے ہیں ــ"

جب وہ اپنے دوست کے ساتھ آفس پہنچا تو بیشتر لوگ جا چکے تھے۔ دو چار ہی لوگ ایسے تھے جو اپنی میزوں پر ابھی تک جُھکے ہوئے تھے۔ خالی میزوں پر کچھ فائلیں بکھری ہوئی تھیں۔ جنھیں ایک نوجوان اٹنڈر سلیقے سے جما رہا تھا۔

"تم نے بڑی غلطی کی جو یہ نوکری چھوڑ دی۔ آج تم بھی یہاں میری طرح پندرہ سو تنخواہ کے حق دار ہو جاتے۔ دوسرا عہدہ ملنے تک پتہ نہیں تمھیں کن کٹھنائیوں سے گزرنا پڑے۔ ویسے میں نے بہت سے لوگوں کو تمھارے بارے میں کہہ رکھا ہے پیسوں کا

بھی اپنی طرف سے انھیں لالچ دیا ہے لیکن بات ابھی تک نہیں بن پائی ہے۔ یار آج موت بھی بے مانگے مل جاتی ہے لیکن نوکری نہیں ملتی —"

اُس کا دوست مسلسل بکے جا رہا تھا اور اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا جیسے وہ خواہ مخواہ یہاں آگیا ہے۔ وہ صبح اپنی بیوی سے لڑائی مول لے کر نکلا تھا۔ لڑائی کی ابتدا اسی نے کی تھی۔ سخت اور تضحیک آمیز جملوں کے تبادلے کے بعد اسے احساس ہونے لگا تھا کہ وہ اب پسپا ہونے چلا ہے۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ جب وہ سروس میں تھا تب بھی یہی عالم تھا۔ لیکن برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ایک دن وہ اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ......"

"کیا سوچ رہے ہو یار ہمیں بھی تو بتاؤ، ایسی بھی کیا غربت ہے؟ — دو تین سو روپے تم مجھ سے لے لو۔ پیسہ جیب میں نہ ہو تو آدمی پاگل بن جاتا ہے۔ کہو تو کل ہی میں اپنے ساتھ پیسے لے آؤں۔ دو سو روپے ٹھیک رہیں گے یا ایک سو ہی میں کام چل جائے گا۔ ویسے تمھارا ابل تو پاس ہو ہی جائے گا۔ تمھاری وہ ایپلی کیشن — ؟"

"وہ تو ٹائپسٹ ہی کے پاس رہ گئی۔"

اس نے اپنے سکوت کو توڑتے ہوئے نڈھال لہجے میں کہا۔ جیسے وہ اب بہت تھک چکا ہو۔

"تم نے اس پر اپنے دستخط کر دیئے تھے — ؟"

"نہیں —"

شاید وہ ایپلی کیشن ٹیبل ہی پر کہیں چھوڑ گئی ہو۔ ذرا اُٹھ کر دیکھو تو اس دوران میں اپنی دکان بند کر لیتا ہوں —"

اس کے دوست کے کہنے پر جب وہ لیڈی ٹائپسٹ کی میز کے قریب پہنچا تو وہاں دو ٹائپ کی ہوئی درخواستیں رکھی ہوئی تھیں۔ جس پر ایک خوب صورت پیپر ویٹ رکھا ہوا تھا۔

"I HAVE TYPED TWO APPLICATIONS.

IT IS UP TO YOU TO CHOOSE ONE OF THEM—"

آفس کی بے ہنگم سیڑھیاں اُترنے تک اُس کے کانوں سے ایک ہی آواز ٹکرا رہی تھی۔

"CHOOSE ONE OF THEM"

جنازے میں سبھی لوگ شریک تھے۔ مگر وہ گھر میں دروازہ بند کیے سوتا رہا۔
سوتا کیا رہا۔ بس یوں سمجھ لیجئے جاگنے اور سونے کے عذاب میں جھلستا رہا۔
اس کے ساتھی نے تیسری بار آکر اُس سے کہا۔ جنازہ اب اٹھنے ہی والا ہے وہاں لوگ باگ تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ چلو چل کر اپنے یار کا آخری دیدار کر لو ــــ"
"جنازہ تو اسی سڑک سے گزرے گا اور میں اس ماتمی جلوس میں شریک ہو جاؤں گا۔"
اس نے عجیب انداز سے کہا۔
"کیا ضروری ہے کہ جنازہ اسی سڑک سے گزرے؟ قبرستان جانے کے لیے اور راستے بھی تو ہیں۔"
"یہی بات تم وہاں آکر کیوں نہیں کہتے کہ یہ سڑک جنازہ جانے کے لیے موزوں ہے۔"
"تم نے مجھ سے سوال کیا، میں نے جواب دے دیا۔ تم چاہو تو میرے خیالات اُن تک پہنچا دو ــــ"
"ٹھیک ہے" اس کے ہونٹوں پر نفرت کی ایک بدصورت لکیر ابھری۔ اور وہ پہلو بچاتا ہوا آگے نکل گیا۔

اب وہ دروازے کے باہر کھڑا اپنے ساتھی کو گلی میں غائب ہونے تک دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ان دو جانے پہچانے آدمیوں کو دیکھا جو کندھوں پر شال ڈالے تیز تیز راستہ طے کر رہے تھے۔

اس نے سوچا شاید یہ لوگ بھی وہیں جا رہے ہوں۔ لیکن خلاف توقع وہ تھوڑی دور جانے کے بعد پلٹ کر اسی راستے پر آگئے جہاں سے وہ تھوڑی دیر پہلے گزرے تھے۔

"کیا آپ نے ادھر سے کسی جنازے کو گزرتے دیکھا ہے؟"

"ابھی تک تو نہیں۔" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"حیرت ہے۔" دوسرے آدمی نے منھ بناتے ہوئے کہا۔

"کیا ضروری ہے کہ وہ جنازہ اسی سڑک سے گزرے؟"

"کون سا جنازہ؟"

"وہی جنازہ جس کے لیے آپ دونوں......"

"کیا آپ بھی......؟"

"نہیں میرا مسئلہ بالکل الگ ہے۔ میرے انتظار کی نوعیت آپ سے مختلف ہے۔"

"گویا آپ کو جنازے کا انتظار نہیں ہے؟" دونوں نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"ہے بھی اور نہیں بھی ـــــ اور اگر ہے تو اسی سڑک پر میری اس سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"جنازے سے؟" ایک نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا اور دوسرے نے اسے اس طرح دیکھا جیسے وہ کوئی مشتبہ آدمی ہو۔

"کیا ضروری ہے کہ جنازہ اسی سڑک سے گزرے۔" اسے لگا جیسے چٹانوں میں دبا ہوا کوئی آدمی اس سے کچھ کہہ رہا ہو۔

"کیا آپ نے کسی جنازے کو ادھر سے گزرتے دیکھا ہے؟"

"ابھی تک تو نہیں۔"

پھر اس نے گھر کے سامنے کھڑے کئی جنازوں کو گزرتے دیکھا۔ یہ سارے جنازے اجنبی تھے وہ لوگ بھی اجنبی تھے جو جنازوں کا بوجھ اٹھائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ فضا میں بڑی گھٹن تھی۔ نہ دن ہی کا احساس ہوتا تھا نہ رات کا۔ کچھ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔

وہ سوچ کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔ اس کے ساتھی نے تو صبح صرف ایک ہی جنازے کی اطلاع دی تھی اور یہ جنازوں کا نہ ختم ہونے والا ماتمی جلوس۔

"یہ کون لوگ ہیں جو موت کی سرحد کو پھلانگ گئے اور مر گئے۔ مگر وہ جنازہ؟ کیا وہ اس سڑک سے نہیں گزرے گا۔ کوئی اور راستے پر چل پڑے گا۔ ان ناہموار راستوں پر جہاں وہ اپنے قدموں کے نشان ثبت کرنا نہیں چاہتا۔ ان ٹیڑھے میڑھے راستوں سے یہ سیدھی سڑک کیا بری ہے جس کے سینے پر وہ صبح سے کھڑا ہے۔ ایک عجیب و غریب کیفیت سے دوچار۔

اچانک اس نے دیکھا۔ دو معمر آدمی جن کے سر کے بال برف کی مانند سفید تھے۔ جن کے کندھوں پر اجلی شالیں تھیں۔ ہاتھ میں عصا تھامے اس کے قریب آرہے ہیں۔ ارے یہ تو وہی لوگ ہیں جن سے وہ صبح مل چکا ہے۔ مگر یہ اتنی جلد بوڑھے کیسے ہو گئے۔ لگتا ہے جیسے کسی تاریخی کھنڈر سے اچانک نمودار ہو گئے ہوں۔ کہیں یہ اس کا واہمہ تو نہیں ہے۔ نہیں نہیں یہ ایک حقیقت ہے۔ وہی چہرے۔ وہی اجلی شالیں۔ وہی سوتی کپڑے۔ سب کچھ وہی۔ وہ ان چہروں کو کیسے بھول سکتا ہے۔

کیا وہ صبح سے اپنے گھر کے دروازے کے باہر نہیں کھڑا ہے؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ وقت چلتے چلتے اچانک تھم گیا ہو۔

مگر یہ کیا؛ اس کے گھر پر کس نے تالا چڑھا دیا۔ صبح تو دروازہ کھلا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ لوگ اس کے سامنے سے گزر گئے اور وہ انھیں دیکھ نہ سکا۔

اسے یہ دیکھ کر مزید حیرانی ہوئی کہ اس کے گھر پر "TO LET" کی تختی لگی ہوئی ہے تو گویا وہ یہ مکان بھی چھوڑ چکا ہے۔ اس کے گھر والوں نے کہیں اور ڈیرا جما لیا ہے۔ لیکن صبح سے شام ہونے تک یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔

اُسے یاد آیا کہ صبح اس کے ساتھی نے گھر آ کر اس سے کہا تھا۔ کیا کہا تھا اس کے ساتھی نے؟ وہ اچانک اس واقعے کو بھول گیا۔ وہ جتنا ذہن پر بار ڈالتا تھا اتنا ہی اپنے ساتھی کے اُگلے ہوئے جملوں کے سرے کو نہ پاتا ـــ

وہ ایک عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ اُسے یہ سڑک بڑی ویران سی لگ رہی تھی۔ ہر جگہ سے کٹی پھٹی ـــ بیمار اور مضمحل۔

مگر وہ سڑک پر اس طرح کیوں کھڑا ہے۔ اس مٹی سے اس کا کیا رشتہ ہے۔

کیا وہ بھی اسی طرح ......

ان ہی حالات میں ....

یوں ہی ....

فضول ....

اُسے کچھ سُجھائی نہ دیا اور وہ بدستور سڑک سے چمٹا رہا۔ اس نے پلٹ کر پھر ایک بار اپنے گھر کو دیکھا۔ دیوار کے سینے میں دھنسی ہوئی وہ "TO LET" کی سیاہ تختی اُسے سانپ کی

طرح پھنکارتی ہوئی محسوس ہوئی. یکبارگی اس نے اپنے قریب ان دو بوڑھوں کو آتے دیکھا۔ جن کے سر کے بال برف کی طرح سفید تھے اور جن کے شانوں پر اجلے رنگ کی شالیں لپٹی ہوئی تھیں۔

"کیا تم نے کبھی جنازے کو اس طرف سے گزرتے دیکھا ہے؟"

"ابھی تک تو نہیں۔"

"حیرت ہے۔" پہلے آدمی نے دوسرے آدمی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کیا ضروری ہے کہ جنازہ اسی سڑک سے گزرے۔"

"کون سا جنازہ؟"

اس بار بہ یک وقت تینوں ایک ساتھ بول اُٹھے اور ایک دوسرے کے گلے لپٹ کر بچوں کی طرح رونے لگے۔!!
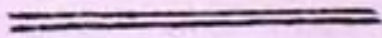
مسہری پر سوئی ہوئی عورت

اسے ایک لمحے کے لیے احساس ہوا جیسے وہ غلط جگہ آ گیا ہے۔ وہ ضرور راستہ بھٹک گیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ جس کمرے میں داخل ہوا تھا وہ اسی کی ملکیت تھا اور تو اور گزرتے جاڑوں کی وہ رات بھی اُسی کی تھی جسے وہ اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

پھر وہ مسہری پر چپ چاپ سوئی ہوئی سرد نعش کے قریب پہنچ کر آرام سے سو گیا۔

اور جب وہ نیند کی گرم آغوش سے باہر نکلا تو ہر طرف سحر کا پر تو تھا۔ اس نے دریچے سے باہر جھانک کر دیکھا دو گوالے سر پہ دودھ کی بالٹیاں لیے دھیرے دھیرے قدم ڈالتے ہوئے راستہ طے کر رہے تھے۔ ایک جاروب کش سڑک صاف کرنے میں مشغول تھا اور اس کے ساتھ بھرے بھرے جسم والی ایک نوجوان عورت بھی تھی جو اس کا ہاتھ بٹانے میں مصروف دکھائی دے رہی تھی۔

اب دریچے سے جھانکتے ہوئے اُسے بڑی بے کیفی کا احساس ہو رہا تھا۔

اس نے پلٹ کر مسہری کی طرف دیکھا وہ عورت ابھی تک بے سُدھ سو رہی تھی۔ جیسے وہ جاگنے اور سونے کے عذاب میں رات بھر مبتلا رہی ہو۔

وہ پھر ایک بار دریچے کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

اب سڑک پر چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ ایک ناٹے قد کا آدمی ایرانی ہوٹل کے کاؤنٹر پر کھڑا سیٹھ سے باتیں کرتا ہوا اطمینان سے چائے پی رہا تھا۔ ہوٹل کی کرسیوں میں دھنسے ہوئے وہ چار آدمی اور بھی تھے جو شاید اخبار کی سرخیوں میں ڈوبے ہوئے حالات حاضرہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ جاروب کش ابھی تک اسی عورت کے ساتھ کھڑا تھا اور وہ اُسے ہاتھ کے اشارے سے کوئی بات سمجھا رہی تھی اور وہ بے ساختہ ہنس رہا تھا۔

اس نے سوچا شاید اس عورت نے کوئی دلچسپ واقعہ اُسے سُنایا ہو۔

لیکن ان ساری باتوں سے اس کا کیا واسطہ ـــــ؟

وہ پھر ایک بار دریچے سے اکتا کر وراندے میں آکر ٹہلنے لگا۔

اب اس کا دھیان مسہری پر بے سُدھ پڑی ہوئی نعش کی طرف نہیں تھا کہیں اور تھا۔ اُن پُر پیچ گھاٹیوں میں جہاں وہ اپنے وجود کو اپنے ہی ہاتھوں دفن کر آیا تھا۔

وہ اب ایک عجیب و غریب اضطراری کیفیت سے دوچار تھا اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے تھوڑی دیر بعد ایک ہولناک طوفان آئے گا اور وہ اس طوفان میں خس و خاشاک کی طرح بہتا ہوا بہت دور نکل جائے گا۔ اتنی دور کہ اس کی نعش کو شناخت کرنے والا بھی کوئی نہ ہو گا ـــــ

ـــــ یہاں تک کہ وہ نعش بھی نہیں جسے اس نے مسہری پر ......

پھر ایک بار اُسے وہ پر پیچ گھاٹیاں یاد آنے لگیں۔

وہ بدصورت پہاڑ اور اس سے ذرا اوپر ٹیڑھے میڑھے پتھروں سے لدی ہوئی وہ تنہا قبر ـــــ اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ اُسے حیرانی ہوئی کہ دُھند میں لپٹی ہوئی صبح ابھی تک چپ چاپ اس کی دہلیز پر کھڑی ہے۔

مگر وہ طوفان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ شاید دبے پاؤں آکر چپ چاپ چلا بھی گیا ہو۔۔۔۔

وہ ایک سحر زدہ آدمی کی طرح پھر ایک بار دریچے کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی نڈھال آنکھیں سڑک کے اس پار پھیلا دیں۔

اس نے سڑک پر کیا دیکھا۔ کن کن چہروں سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں اُسے کچھ یاد نہ تھا۔

اُسے احساس ہو رہا تھا اس کے وجود کی طرح اب یہ در و دیوار بھی زخمی ہو گئے ہوں۔ اچانک اس کی نگاہ دروازے پر گئی جہاں صبح کا تازہ اخبار دروازے میں پھنسا ہوا تھا۔ شاید اخبار والے نے آواز دی ہو اور جواب نہ پا کر عجلت میں اخبار کو دروازے ہی میں پھنسا دیا ہو۔

وہ بھی کتنا بے وقوف آدمی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی فضول باتوں ہی پر غور کرتا ہے! اور۔۔۔۔

پھر شاید اُسے ناشتے کا خیال آیا۔ اس نے اسٹور روم پہنچ کر پلیٹوں کی تلاش شروع کر دی۔ بغیر مانجھی ہوئی پلیٹوں کے ساتھ اُسے چھوٹے بڑے کئی کٹورے بھی دکھائی دیے۔ جس پر گرد اٹی ہوئی تھی۔

وہ پھر ایک بار ماضی کی دھندلاہٹوں میں ڈوب سا گیا۔

اب ناشتہ بھی اُسے ایک فضول سا فعل لگا۔

آدمی بغیر ناشتہ کیسے بھی رہ سکتا ہے۔

اس کے لیے یہی طمانیت ہی کافی تھی کہ اس کے برتن میں اس کی حیثیت سے

کہیں زیادہ نوٹ تھے۔ وہ اِن نوٹوں کو ایک ایک کر کے گننے لگا۔

"صاحب ناشتہ" اچانک اس کے کانوں میں ایک عجیب و غریب آواز اُبھری اس نے دروازہ کھول کر دیکھا ایک نوجوان بیرا ہاتھ میں کھانے کی کشتی تھامے کھڑا تھا۔

"۴۲ نمبر ——"

"مگر یہ تو ۲۲ نمبر ہے۔" اس نے بیرے کی غلط فہمی دور کر دی۔

اور نیچے کمرے میں داخل ہو کر پھر ایک بار اس عورت کو دیکھا جو ابھی تک مسہری پر بے سُدھ سو رہی تھی۔

وہ کچھ دیر کھانے کی خالی میز کے اطراف یونہی بے معنی انداز میں ٹہلتا رہا۔ اس کا جی چاہا کہ جانے سے پہلے اسے نیند سے جگا کر یہ کہہ دے کہ وہ جا رہا ہے اور وہ اُٹھ کر دروازہ بند کر لے۔

اس نے بڑی مشکل سے اپنے لبوں کو جنبش دی اور اس کی کپکپاتی ہوئی آواز گھر کے ہولناک سناٹے میں دب کر رہ گئی ——"

پنجرہ

وہ دھواں دھواں سی سلگتی ہوئی شام اُسے آج بھی یاد تھی جب اس کھنڈر نما حویلی پر اس نے پہلی بار دستک دی تھی ایک نہیں کئی بار ــ مگر حویلی کے در و دیوار خاموشی کا لبادہ اوڑھے کسی بے جان بت کی طرح چپ چاپ کھڑے تھے۔

ہر طرح کی کوشش کے بعد جب کوئی شنوائی نہ ہوئی تو وہ مایوس ہوکر اس آدمی کی تلاش میں نکل پڑا تھا جس نے اُسے اس کھنڈر نما حویلی کا پتہ بتایا تھا مگر دور دور تک اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔

آج پھر وہ اسی حویلی کے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ مگر دروازے کے منہ پہ ایک بڑا سا تالا پڑا تھا۔ ایک زنگ خوردہ عجیب و غریب تالا ــ وہ بڑی دیر تک دروازے کے منہ میں دھنسے اس بے ڈھنگے بدصورت تالے کو بغور دیکھتا رہا۔

یہ تالا کبھی کھلے گا بھی یا اسی طرح ...... وہ سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب سا گیا۔

اچانک اُسے لگا جیسے دور کسی خاردار جھاڑیوں میں پھنسا ہوا آدمی زخمی لہجے میں آپ ہی آپ بڑبڑا رہا ہو۔

"بند دروازوں پر دستک دینا ہی آدمی کا مقدر ہے"

اس نے آنکھیں پھاڑ کر خار دار جھاڑیوں میں پھنسے آدمی کو دیکھا جو اپنی ذات کی آگ میں سلگتا ہوا۔ آپ ہی آپ جل رہا تھا۔ مگر اُسے تو اس اجنبی کی تلاش تھی جس نے اُسے ..... یہ سوچ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے چل پڑا۔ اُسے یکبارگی احساس ہوا کہ وہ جس سڑک پر چل رہا ہے اس کے سینے سے لہو کی بوندیں آہستہ آہستہ ٹپک رہی ہیں۔ اُسے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ لہو میں ڈوبی ہوئی اس سڑک کے آخری کنارے پر وہ اکیلا بیٹھا اطمینان سے سگریٹ کے پے در پے کش لگا رہا ہے۔

ابھی وہ اس سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ اچانک بول پڑا۔

"کسی کے گھر دی ہوئی دستک کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ مگر تم حویلی کا دروازہ توڑ نہیں سکتے کہ تم ایک مُ چکے نہیں۔ شریف زادے ہو۔ میں جانتا ہوں تم یہاں یہی کہنے آئے ہو کہ وہاں کسی نے تمھیں گھاس نہیں ڈالی شاید وہاں وہ بوڑھا بیند کے ہنگوڑے میں پڑا بے سُدھ سو رہا ہو۔ مگر نہیں اس بوڑھے کے کانوں تک تمھاری دستک کی بیمار آواز نہ پہنچی ہو۔

تمھیں اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب مقدر یاوری پر اُتر آئے۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنا کاروبار ترک کر دیا ہو۔ کسی بھی یکسانیت سے آدمی جلد ہی اُوب جاتا ہے۔ مجھے ہی دیکھو۔ کل تک بندر چھاپ بیڑی پیا کرتا تھا۔ آج سگریٹ پی رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ کل سگریٹ کی بجائے کوئی اور مہنگا یا گھٹیا نشے کا عادی ہو جاؤں۔ مگر ان باتوں سے تمھارا کیا تعلق۔

میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں ایک ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں تم سکھ اور شانتی سے رہ سکو۔ سکھ اور شانتی کا مطلب سمجھتے ہو نا؟

اب اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ رینگ آئی تھی وہ بڑی قاتلانہ تھی

"مگر میں تو اس پرانی حویلی کی بات کر رہا تھا"۔

اب تک جو میں نے باتیں کیں۔ کیا وہ اس حویلی کے بارے میں نہیں تھیں۔ اگر نہیں تھیں تو وہ حویلی کی پیشانی پر سنہری تختی کا آویزاں رہنا؟

اس کی گفتگو کا یہی سلسلہ جاری تھا کہ ایک آوارہ لونڈا درمیان میں آٹپکا۔ چھٹا ملے گا۔ میرے ہاں پچاس کا ایک نوٹ ہے۔ اس نے جب دوبارہ یہی ہانک لگائی تو وہ چیخ پڑا۔ ابے سالے ادھر کیوں مرنے چلا آیا۔ دیکھتا نہیں ایک اہم گتھی سلجھتے سلجھتے رہ گئی ہے۔

جب لونڈا منڈیر پھاند کر آگے نکل گیا تو اس نے اطمینان سے کہا۔ تمہیں گھر — ٹھکانہ — سائبان سب کچھ مل جائے گا۔ مگر کمزور اور ناتوان دستک سے کام نہ چلے گا۔

مگر وہ وہی جگہ تو تھی جہاں تم نے جانے کا مشورہ دیا تھا۔

میں نے تمہیں راستے کی نشان دہی کی تھی، منزل کا پانا یا نہ پانا یہ تمہارا مسئلہ ہے۔

اب اسے اچانک احساس ہوا کہ یہ وہ آدمی نہیں ہے، جس نے اسے حویلی پر پہنچ کر دستک دینے کو کہا تھا۔ یہ اسی کی قبیل کا کوئی دوسرا آدمی ہے جو بڑا کائیاں ہے۔ مگر اس کا چہرہ تو ہوبہو وہی ہے۔ نہیں نہیں یہ کوئی دوسرا آدمی

نہیں ہے۔ یہ وہی ہے تو پھر وہ کون تھا جس نے اُسے . . . .

اب وہ ایک عجیب اضطراری کیفیت سے دوچار سڑک پر تیز تیز چلنے لگا۔ لیکن وہ سینہ تانے پھر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں نہیں چاہتا تھا کہ اس حویلی میں دوبارہ قدم رکھوں۔ مگر تمہاری خاطر یہ بھی گوارا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کے کندھوں کو پیار سے یوں تھپتھپایا جیسے وہ اسی کی ذات کا ایک اہم حصہ ہو۔

اب وہ ایک آسیب زدہ انسان کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

"آج یہ سڑکیں مجھے کچھ زیادہ ہی زخمی لگ رہی ہیں دیکھو لوگ کتنے کم کم دکھائی دے رہے ہیں اور کس قدر حیران اور خوف زدہ ——— میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔"

اس نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"زمین پر انسانی قافلوں کا بڑا بوجھ ہے۔ اُسے وقتاً فوقتاً زخمی ہونا ہی چاہیے۔ تم ان باتوں پر غور کرنے لگو گے تو کینسر میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ یہ المیہ ہی کیا کم ہے کہ ہم جی رہے ہیں۔

خواہ وہ کسی روپ میں کیوں نہ ہو۔

پھر اس کے ساتھ وہ کب اور کس طرح اُس پرانی حویلی میں داخل ہوا اُسے کچھ یاد نہ تھا۔ جیسے کبھی نیند میں اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ وہ بڑے بڑے دیو ہیکل ویران سے کمرے۔ وہ عجیب و غریب دالان اور اس پر بچھی ہوئی کئی گرد آلود دریاں۔ پنگوڑے میں چپ چاپ لیٹا ہوا وہ سفید براق سا بوڑھا۔ قدرے کھلا ہوا منہ اور پپوٹوں میں چھپی ہوئی

وہ ادھ کھلی آنکھیں۔ صحن میں لٹکا ہوا وہ زنگ خوردہ پنجرہ جس میں ہرے رنگ کا ایک منحوس طوطا جو مسلسل ٹرٹرا رہا تھا۔ "بھاگ جا۔ بھاگ جا" اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے حویلی کے در و دیوار پر چمٹے ہوئے بے شمار زہریلے کیڑوں کو رینگتے ہوئے دیکھا۔ یکبارگی اُسے لگا جیسے سارے زہریلے کیڑے اس کے جسم سے چمٹ گئے ہوں۔ پھر اچانک ہوا کا ایک طوفانی جھونکا آیا اور ڈولتے ہوئے پنجرے سے وحشت زدہ طوطے کی کریہہ آواز اُبھری۔

"بھاگ جا۔ بھاگ جا"

اُسے قریب ہی ایک بھاری پراسرار آواز سنائی دی۔

"اب آگئے ہو تو گھبراؤ نہیں، یہ پاگل طوطا تو ہمیشہ یوں ہی ٹرٹراتا ہے۔"

پُل صِراط

دھپ ۔ دھپ ۔ دھپ ـــــــ باہر کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا۔

"کون ہے ؟" لحاف کے اندر سے ایک کپکپاتی آواز اس طرح گونجی جیسے دور کوئی گہرے کنویں سے بول رہا ہو۔

دھپ ۔ دھپ ۔

"ارے بھئی کون ہے ؟ اِتنی رات گئے کیا کام ہے"۔

"میں ہوں قاسم"

"کون قاسم بھئی"۔

"قاسم تمہارا دوست"۔

"میرا دوست ؟" اس نے حیرانی سے منھ ہی منھ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"تم موہن داس ہو نا ؟"

"ہاں ہاں میں موہن داس ہوں"۔ اجنبی کی زبان سے اپنا نام سن کر اس نے بغیر سوچے سمجھے جی کڑا کرکے دروازہ کھول دیا۔

اب اُس کے سامنے ایک اونچے پورے قد کا آدمی کھڑا تھا گلے میں میلا کچیلا

مظفر بیٹا وہ کسی اور دُنیا کا باشندہ لگ رہا تھا

رات کے گھُپ اندھیرے میں اُسے چہرا پہچاننے میں دِقت ہو رہی تھی۔

"یہاں اندھیرا کیوں ہے؟" اُس نے سانپ کی طرح لٹکتے ہوئے مظفر کو اپنے گلے کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

"لائٹ بند ہے بھئی"۔ اس کی آواز میں نرمی اور کپکپاہٹ پیدا ہوگئی تھی شاید یہ سر پر منڈلاتے ہوئے انجان خوف کا اثر تھا۔

"یہاں کی لائٹ آج بند کیوں ہے؟"

"یہاں کا بجلی گھر کمزور ہے"۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

بجلی گھر —— بجلی گھر —— بجلی گھر سے لگا کسی وقت میرا ایک چھوٹا موٹا سا گھر تھا جس میں امرود کا ایک بوڑھا درخت بھی تھا اور اس سے پرے ایک کنواں جس میں بوڑھے حافظ جی نے چھلانگ لگا کر جان دے دی تھی جیسے وہ ماضی کے چہرے سے آہستہ آہستہ نقاب اُٹھا رہا تھا۔

اچانک اس کے ذہن کی سلیٹ پر بہت سے چہرے اُبھرے۔ دُھندلے دُھندلے۔ مٹیالے مٹیالے۔ ان ہی میں قاسم نامی ایک لڑکا بھی تھا جو اُس کا دوست تھا۔

پھولے پھولے گالوں والا گورا چٹا قاسم۔ مگر اب اس کے سامنے جو آدمی کھڑا تھا وہ قاسم کیسے ہو سکتا تھا۔

"کیا تم مجھے اندر نہیں بلاؤ گے"۔

"اندر تو کھاٹ بھی نہیں ہے"۔

"سیلی زمین تو ہے جو ہمارا مقدر ہے"

پھر اچانک کمرے میں روشنی پھیل گئی تو اس نے تیزی سے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیے۔

"یہ تم نے اپنا چہرہ کیوں چھپا لیا ہے؟"

"مجھے روشنی اچھی نہیں لگتی۔"

"روشنی کے لیے تو آدمی جیتا ہے۔"

"مگر میں اندھیرے کا پرستار ہوں اس لیے تم سے ملنے کے لیے اماوس کی یہ رات چُنی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"اتنی رات گئے کس سے باتیں کر رہے ہو بیٹے؟" قریب کے کمرے سے ایک بوڑھی بیمار سی آواز آئی۔

"کوئی بھی نہیں ہے ماں۔ تو اب سو جا۔ رات ڈھل چکی ہے۔"

میں اس آواز سے آشنا ہوں۔ یہ دھرتی کی کوکھ سے جنم لینے والی ممتا بھری آواز ہے، مجھے یہ آواز بڑی بھلی لگتی ہے لیکن میں اس آواز سے ڈرتا بھی ہوں۔ یہ آواز سائے کی طرح میرا پیچھا کرتی ہے۔ اس گاؤں میں اب میرا کوئی بھی شناسا باقی نہیں رہا۔ سُنا ہے کہ سب لوگ یہاں سے کبھی کے جا چکے ہیں۔"

"غنیمت ہے کہ ابھی کچھ لوگ یہاں باقی ہیں۔" اس نے رُکتے رُکتے جواباً کہا۔

"کیا تم مجھے اُن لوگوں سے ملا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں ضرور۔"

"یہ لوگ وہی ہیں نا جنھوں نے آخر دم تک .... ابھی اس نے ادھورا جملہ مکمل بھی نہ کیا تھا کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا سنسناتا ہوا آیا اور چوبی دروازے کے کھلے ہوئے پٹ اچانک بند ہو گئے۔

اس کے ہونٹوں کے کنارے پر طنز آمیز مسکراہٹ رقصاں تھی پھر اس نے کہا۔

"میں نے کبھی بہتے پانی کی چادر پر ایک بند باندھا تھا لیکن طوفانی ہوائیں سیلاب اور دریاؤں میں بہتا ہوا۔ سنہرا پانی مجھے بہت دور بہا لے گیا۔ اس مٹی سے میری کچھ یادیں وابستہ ہیں جو میرا شخصی سرمایہ ہے۔ میں میلوں چل کر یہاں اس لیے آیا ہوں کہ انھیں ٹٹول ٹٹول کر دیکھ سکوں۔"

مگر اتنی رات گئے یہ سب کچھ کیسے ہوگا؟ یہ اماوس کی رات ہے۔"

یہ رات میری زندگی کی سب سے اہم رات ہے۔ میں اس پل صراط سے آج ہی گزر جانا چاہتا ہوں۔"

"یہ کام تو دن کے اُجالے کا محتاج ہے۔ ارے لائٹ پھر بند ہو گئی۔ یہ بجلی گھر بھی عجیب شے ہے۔"

"مجھے یہاں سے فوراً اس قبرستان لے چلو جہاں میرا باپ منوں مٹی کے ڈھیر کے نیچے پڑا سو رہا ہے۔ میں اُسے چلتے چلتے جگانا چاہتا ہوں۔ صبح سویرے مجھے یہاں سے چلا جانا ہے۔ وقت بہت کم ہے ایسے میں قبرستان میں داخل ہونے کا مطلب سمجھتے ہو نا ــــــ؟"

"قبرستان ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں آدمی کو سکون ملتا ہے۔ پھر یہاں تو میرا عظیم باپ دفن ہے۔"

اس کے اصرار میں نمناک ہواؤں کا بہاؤ تھا اور وہ اس بہاؤ میں دور دور تک خس وخاشاک کی طرح بہتا چلا گیا۔

اب وہ قاسم کے ساتھ اس ویران قبرستان میں کھڑا تھا۔ فضا پر موت کی سی خاموشی محیط تھی اور رات کی خمار آلود آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

"اس قبر کو دیکھ رہے ہو؟" قاسم نے ایک بوسیدہ مٹیالی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو اُسے دور سے اُلٹی نظر آ رہی تھی۔

"یہ قبر گاؤں کے زمیندار کی ہے۔ یہاں کے لوگ تو یہی کہتے ہیں۔"

"یہاں کے لوگ جھوٹے ہیں۔ یہ قبر اس وقت بھی ٹیڑھی تھی اور آج بھی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے باپ کی قبر کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔ اس نے لرزتی آواز میں آہستہ آہستہ دُعا پڑھی۔ اس کے پیچھے وہ بھی ہاتھ باندھے چُپ چاپ کھڑا تھا۔

صبح ہونے میں صرف دو گھنٹے باقی رہ گئے ہیں اور صبح سے پہلے مجھے یہ سرحد پار کر لینی ہے۔ آؤ اب تمھارے گھر چلیں۔ تمھارے گھر کی سیلی مٹی مجھے سونے کے لیے بُلا رہی ہے۔"

صبح ہونے میں صرف دو گھنٹے باقی رہ گئے ہیں — صبح ہونے میں صرف دو گھنٹے باقی رہ گئے ہیں — صرف دو — گھنٹے۔ جیسے ہوا بھی یہ چیختی چلاتی یہی کہہ رہی تھی۔

قاسم چُپ تھا۔ اس کی بڑی بڑی نڈھال آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ وہ دونوں قبرستان سے نکل کر ایک لمبی سڑک پر چلنے لگے۔

اس نے پلٹ کر پھیلے پھیلے، نیلگوں آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی اضطراری کیفیت سے دوچار تھا۔

پھر اس کی نیند سے بوجھل آنکھوں نے دیکھا صبح ہو رہی تھی اور قاسم بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا تیزی سے سرحد پار کر رہا تھا۔!!

منجمد لمحے

وہ تینوں بے ارادہ گھر سے نکل پڑے تھے۔ تینوں بہ اعتبار صحت و مزاج ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ پہلا طبعاً کم گو تھا ناپ تول کر بات کرتا تھا۔ دوسرا بے حد باتونی تھا۔ تیسرا نہ باتونی ہی کے زمرے میں آتا تھا اور نہ کم گوئی سے اُس کی یاری تھی۔ مگر یہ تینوں یاروں کے یار تھے، مزاجوں کے اس تفاوت کے باوجود وہ ایک دوسرے کے گہرے دوست اور غم خوار تھے۔

اِن تینوں میں ایک ہی قدرِ مشترک تھی وہ تھا اُن کا گھرانا جو نہ خوش حال تھا اور نہ بہت زیادہ غریب۔ کم گو آدمی عمر میں اپنے ساتھیوں سے کچھ بڑا تھا لیکن اس نے ابھی شادی نہیں کی تھی۔ وہ شادی کو ایک فضول شئے سے تعبیر کرتا تھا۔ اُس کے دونوں ساتھیوں نے نہ صرف شادی کی تھی بلکہ بچے بھی پیدا کیے تھے۔ دونوں کو اپنی بیویوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اور اس عہد سے بھی جس میں وہ سانس لے رہے تھے۔

وہ جلی کٹی سُنانے کے لیے ہمیشہ اُس آدمی کے پاس آتے جو خاموشی کا گہرا سمندر تھا۔ تیسرا جو زیادہ باتونی نہ تھا کبھی کبھار پہلے کی خاموشی کو توڑنے میں

کامیاب ہو جاتا تھا۔

نت نئی پیچیدگیوں کا لحاف اوڑھے وہ جب اُس کے پاس آتے تو اُسے یقین ہو جاتا کہ آج اُنھیں پھر مشورے کی ضرورت ہے ساری روداد سُننے کے بعد جب وہ چپ چاپ بغیر جواب دیے کرسی سے چمٹا رہتا تو اُنھیں کوفت سی ہوتی۔ مگر ہر نازک مرحلے پر وہ پہلے آدمی ہی سے رجوع ہوتے۔ "بھلا یہ بھی کوئی آدمی ہے جو ساری روداد سُننے کے بعد بھی اپنی زبان پر لگے تالے کو نہیں کھولتا۔

ایک دن یہ تالا کھل ہی گیا۔ سوچ کی گہرائیوں میں ڈوب کر اُس نے جو کہا وہ کچھ یوں تھا کہ آدمی کو پہلے اپنے گھر کو خیرباد کہنا چاہیے۔ چنانچہ پہلے آدمی کے سامنے دونوں نے سپر ڈال دی۔

اب ان کا کوئی گھر نہیں تھا۔ وہ بے گھر تھے۔ ان کی کوئی منزل نہ تھی۔ جہاں بھی ٹھہر جاتے وہی ان کا گھر ہوتا۔ بے ستون — بے امان گھر۔

کئی دنوں تک وہ یوں ہی ایک شہر سے دوسرے شہر تک بھٹکتے رہے۔ جیسے وہ دربدر کی ٹھوکریں کھانے ہی کے لیے پیدا ہوئے ہوں۔

پھر جب شہر کی سرحدیں شام کی سیاہی میں ڈوبنے لگیں تو دفعتاً اُنھیں احساس ہوا کہ وہ کسی گاؤں کی سرحد میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب وہ تینوں گاؤں کی پگڈنڈی پر چپ چاپ چل رہے تھے مگر خاموشی انھیں ناگ کی طرح ڈس رہی تھی۔

وسوسوں کے کئی بھوت۔ جیسے مُنھ پھاڑے اُنھیں تک رہے تھے۔

"یہاں نہ لوگ ہی دکھائی دے رہے ہیں اور نہ جانور۔ صرف سوکھے ہوئے

خشک کنویں۔"

"موت کے کنویں میں چھلانگ لگانے سے پہلے آؤ کوئی چشمہ تلاش کریں۔"

"شاید وہ بھی سوکھا ملے۔"

"پھر تو ہم زندہ درگور ہو جائیں گے۔"

"وہ تو پہلے ہی سے ہیں۔"

"تو پھر شہر لوٹ چلیں۔"

"آگے جانے کے بعد واپس لوٹنا بزدلی کی علامت ہے۔"

"مگر ہم نکلے ہی کب تھے؟"

"کیا تم نے کچھ کہا۔؟"

"نہیں۔"

"کیا تم نے؟

تو پھر ...... ؟ یہ آواز ـــــ یہ گونج۔ کہاں سے آئی۔

"کچھ پتہ نہیں؟ ـــــ"

"مگر آواز تو آئی تھی"

"پھر وہی آواز کی رٹ"

دفعتاً انھیں احساس ہوا کہ وہ شاید سفر کے لیے نکلے ہی نہ ہوں اپنے اپنے گھروں ہی میں بند ہوں، محض یہ ان کا واہمہ ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے گھروں کو کبھی کے خدا حافظ کہہ دیا ہے ـــــ مگر وہ ہماری بیویاں اور بچے ـــــ؟

کس کی بیوی کیسے بچے۔؟

ہم تو ابھی تک ؟

وہ پھر ایک بار ذہنی طور پر بالکل ماؤف ہو چکے تھے ــــ دراصل وہ زندگی کی پیچیدگیوں میں کچھ اس طرح الجھ گئے تھے کہ انھیں سچ بھی جھوٹ سا لگ رہا تھا۔

وہ آدمی ہمیشہ کی طرح اب بھی گُم صُم سا دکھائی دے رہا تھا۔

"کبھی اس نے بات بھی کی تو اس طرح جیسے وہ اپنے ساتھیوں پر احسان کر رہا ہو۔ وہ دونوں دِل ہی دِل میں اس سے شاکی اور ناراض دکھائی دے رہے تھے۔

وہ تینوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے لیکن جب وہ چلتے چلتے قدرے پیچھے رہ گیا تو دونوں نے بیک زبان ہو کر کہا: کیا یہ موقع ٹھیک نہیں ہے ہم اُسے چکمہ دے کے بہت آگے نکل جائیں یہاں تک کہ وہ ہمیں تلاش کرتے کرتے ادھ مُوا سا ہو جائے!"

"مگر وہ تو شیو کی آنکھ رکھتا ہے۔ وہ ہمیں ٹٹول لے گا۔

"لو وہ تیز تیز قدم ناپتا آ ہی گیا"۔

اب وہ قدم سے قدم ملائے راستہ طے کر رہے تھے۔ پھر دفعتاً انھوں نے سامنے سے ایک بس کو آتے دیکھا اُسے رک جانے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے بس روک دی۔ بس میں صرف تین ہی مسافر تھے جو بیٹھے بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ ان کی وضع قطع بھی عام لوگوں سے قدرے جُدا تھی۔ ڈرائیور نے بجھتی بیڑی کے آخری سرے کو کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے کہا۔

"بیٹھنا ہو تو جلد بیٹھ جاؤ۔ پتہ نہیں یہ بس شہر پہنچ سکے گی بھی یا نہیں؟

وہ سہمے سہمے ڈرائیور کے کہے ہوئے جملے کے زیر و بم میں کھو گئے۔ پہلے تو

دوسرے کی طرف دیکھا۔ دوسرے نے تیسرے کی طرف، پھر جیسے وہ ایک خاموش معاہدے کے تحت ایک ایک کر کے بس میں سوار ہو گئے۔

جب بس فراٹے بھرنے لگی اونگھنے والے مسافروں میں سے ایک نے جس کی آواز قدرے سپاٹ تھی کمبل میں چھپے ہوئے چہرے کو نمایاں کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ تینوں کو بھی شہر جانا ہے"

"ہاں ــــ" تینوں نے بیک آواز کہا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب وہیں جا رہے ہیں اسی قتل گاہ کی طرف۔

سب اس جواب پر چونک پڑے اور ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

بس بدستور فراٹے بھر رہی تھی۔ گاؤں کے سوکھے کھیت کھلیان۔ کنوئیں پگڈنڈیاں جیسے لمحہ لمحہ ان کی آنکھوں میں برچھیاں سی چبھو رہی تھیں۔

پھر رفتہ رفتہ ان پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا اور وہ سو گئے۔

ایک خاص موڑ پر پہنچنے کے بعد جب ڈرائیور نے بس روکی تو انھیں احساس ہوا کہ وہ لوگ تو راستے ہی میں کہیں اتر گئے اور اپنے کمبل بھی یہیں چھوڑ گئے۔

"کمبل ــــ؟"

"ہاں وہ دیکھو ہوا کے دباؤ سے تھرتھرا رہے ہیں۔"

اب بس ہچکولے کھاتے ہوئے بھی جیسے زمین کے سینے کو چھید رہی تھی اور وہ بس کی سیٹوں سے چمٹے ہوئے یوں لگ رہے تھے جیسے وہ آدمی نہ ہوں۔

بھوتوں کے غول ہوں۔ لگتا ہے یہ برفیلی اور چبھتی ہوئی ہوائیں ہمیں برف کے تودے میں ڈھال دیں گی۔ اور ہم ـــــ؟

وہ اس عجیب و غریب تصور ہی سے کانپ رہے تھے۔

دونوں کی سرگوشیاں جب فضا میں قطرہ قطرہ بن کر ڈوب گئیں تو انھوں نے سر اٹھا کر تیسرے آدمی کی طرف دیکھا جو دور الگ تھلگ سا بیٹھا تھا۔

اُس کا چہرا ردِ عمل سے بالکل خالی تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ ریشم کے کیڑے کی مانند اپنے خول ہی میں بند ہو کر رہ گیا ہو۔ اس کی یہ لاتعلقی اُنھیں بے طرح کھل رہی تھی۔

وہ بڑی دیر تک یوں ہی کُڑھتے رہے اور جب نیند کے بوجھ سے آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں تو وہ ایک دوسری دُنیا میں چلے گئے۔ اور جب اچانک آنکھ کھلی تو مُندی مُندی آنکھوں سے انھوں نے دیکھا۔

بس ایک خاص موڑ پر رُکی کھڑی تھی۔

اور ڈرائیور ایک بدہیئت کٹے ہوئے ہاتھ والے آدمی سے کھسر پھسر کر رہا تھا جب پلٹ کر انھوں نے تیسرے آدمی کی طرف دیکھا تو ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

تیسرا آدمی اب سیٹ سے غائب تھا!!

صحرا کی پیاس

گو وہ دونوں قریب بیٹھے ایک پیچیدہ مسئلے کا حل دریافت کر رہے تھے

لیکن ایسا لگتا تھا جیسے دونوں کے درمیان میلوں کا فاصلہ ہو۔

"یہ باہر دبے دبے انداز میں دروازہ کون کھٹکھٹا رہا ہے۔ مجھے یہ آواز کچھ مانوس سی لگ رہی ہے"۔

"یہ آپ کا وہم ہے۔ میں کہتی ہوں آپ سو جایئے۔ آپ کا دماغ منتشر ہے"۔

"اتنی رات گئے بھلا کون آئے گا"۔

"کیا فرزانہ گھر آ چکی ہے"۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ فرزانہ نے مدت سے باہر جانا چھوڑ دیا ہے"۔

"وہ دیکھو پھاٹک کے قریب کوئی کھڑا ہے میں اس چلتے پھرتے سائے کو خوب جانتا ہوں اس بدمعاش سے کہہ دو کہ وہ اس گھر سے اور کیا لینا چاہتا ہے؟"

"پھاٹک کے پاس تو کوئی بھی نہیں ہے۔ ہاں ملتانی صاحب کا کتا ضرور ہے کیا آپ کو کتے اور انسان میں فرق معلوم نہیں ہوتا"۔

"عجیب خارشی کتا ہے۔ رات ہوتے ہی پھاٹک سے سر ٹکراتا ہے۔

ایک دن سر ٹکرا کر یوں ہی مر جائے گا۔ مگر اسے ایک ہڈی بھی یہاں سے نہیں ملے گی۔"

پھر اچانک اس کے ذہن کے پردے پر ایک ڈراؤنی سی مووی گھوم کر رہ گئی۔ ملتانی کیرم کھیل رہا ہے۔ وہ ہاجرہ سے کہہ رہا ہے۔ "بھابی آپ میں اور فرزانہ میں اتنی مشابہت ہے کہ کوئی اجنبی دیکھ لے تو یہی سمجھے گا کہ آپ فرزانہ کی بڑی بہن ہیں۔ بھابی یہ کشمیری سلک کی ساڑی میں نے آپ کے لیے خریدی ہے اور ہاجرہ اسے خوشی خوشی قبول کر رہی ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اسے احساس ہو رہا ہے کہ اس گھر کی ایک ایک چیز پر ملتانی کی شخصیت اثر انداز ہو رہی ہے۔

"ہاجرہ ایک بات پوچھوں۔ ملتانی کے تعلق سے تمھاری کیا رائے ہے؟"

اس کے اس عجیب و غریب سوال سے جیسے بھونچال سا آگیا۔

وہ غصّے سے تمتماتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

مجھ سے جواب سننا چاہتے ہیں نا آپ تو سُن لیجئے کہ وہ آپ کا دوست ہے۔ ایک دم لفنگا اور غنڈہ ـــ مجھے اس کی صورت سے نفرت سی ہو گئی ہے اور ساتھ ساتھ آپ سے بھی۔

جب میں نے اسے اچھا آدمی سمجھا تو آپ نے مجھے غلط روشنی میں دیکھا۔ جب میں نے آپ سے کہا کہ اس سے کہہ دیجئے کہ وہ یہاں نہ آئے تو آپ نے فرزانہ کی آڑ لے کر صلح کر لی۔ وہ یہاں کیوں آتا ہے۔ اس کا یہاں کیا دھرا ہے۔ وہ ڈرائینگ ـــ روم کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا آنگن میں للچائی ہوئی نگاہیں کیوں ڈالتا ہے۔ وہ آخر اس گھر کو کیا سمجھتا ہے؟"

مگر تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ اسی نے فرزانہ کو انسٹی ٹیوٹ میں جگہ دلائی۔

بھاڑ میں جائے ملتانی، فرزانہ اور اس کی سروس۔

"یہی کیا کم ہے کہ رات کے نو بج چکے ہیں مگر وہ ابھی تک گھر نہیں لوٹی۔"

"اوہ! تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ فرزانہ اب بچی نہیں رہی کسی وجہ سے دیر ہو گئی ہو گی۔ ابھی اُس نے جملہ مکمل ہی کیا تھا کہ فرزانہ اندر داخل ہوی۔ اُس نے ہاجرہ کی طرف دیکھا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پھر ایک دن اس نے سوچا۔ کیوں نہ فرزانہ کا انسٹی ٹیوٹ دیکھ لیا جائے۔ وہ اس خیال سے گھر سے نکل پڑی۔ اُسے انسٹی ٹیوٹ کا پتہ لگانے میں بڑی دقت ہوی ایک سنسان سی پارسی گلی پار کرنے کے بعد سامنے ایک بیڑی کا کارخانہ تھا جہاں بے شمار مزدور بیٹھے بیڑی کے پتوں کو صاف کر رہے تھے۔ اِس سے ذرا پرے ایک لمبی گلی تھی جو گھومتی ہوی شاہراہ کی طرف نکلتی تھی۔ اُس کی نظر جب کے کے انسٹی ٹیوٹ کے بورڈ کی طرف گئی تو اس کے قدم اچانک رُک گئے۔

انسٹی ٹیوٹ کیا تھا ایک بنگلہ نما مکان تھا جس کے اطراف و اکناف باڑ لگی ہوی تھی۔ برآمدے میں ایک گوری چٹّی عورت۔ بیٹھی ہوی پان چبا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خمار جھلک رہا تھا اور کپڑوں سے عطر کی تیز خوشبو آ رہی تھی۔ پہلی نظر میں اُسے یہ عورت کچھ عجیب سی لگی۔ وہ پان یوں چبا رہی تھی جیسے بکری گھاس کھا رہی ہو۔

"یہی کے کے انسٹی ٹیوٹ ہے نا" اس نے اس اجنبی خاتون سے پوچھا۔

"جی ہاں اس محلّے میں یہی ایک انسٹی ٹیوٹ ہے جسے میں پچھلے ایک برس سے۔

چلا رہی ہوں۔ مجھے گوہر سلطانہ کہتے ہیں۔ میں اس ادارے کی مالک بھی ہوں اور پرنسپل بھی۔ فرزانہ ابھی ابھی گھر واپس گئی ہے۔"

آپ نے کیسے پہچانا کہ میں فرزانہ ہی کے لیے یہاں آئی ہوں؟"

بس یوں ہی میری چھٹی حس کہہ رہی ہے۔"

وہ حیران سی رہ گئی۔ "مگر یہ آپ نے انسٹی ٹیوٹ کو جلدی چھٹی کیوں دے دی"

"ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ وہ تو لڑکیوں پر منحصر ہے مجھے ہر حال میں ان کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔" پھر اس نے گلا پھاڑ کر کلثوم کی ہانک لگائی۔

ایک پندرہ سولہ برس کی سانولے رنگ کی لڑکی بال بکھرائے سامنے آکھڑی ہوئی

"اری کم بخت کہاں مر جاتی ہے۔ ذرا چائے تو لے آ۔"

"اس تکلف میں نہ پڑیے۔ مجھے اس وقت گھر جلد پہنچنا ہے۔ پھر کبھی ادھر آنا ہوا تو ضرور پی لوں گی۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی گوہر نے بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ "وہ آپ کی مرضی" کہہ کر چپ ہو گئی۔

اب وہ راستہ چلتے ہوئے بھی سوچ رہی تھی۔ یہ گوہر سلطانہ کیسی عورت ہے۔ چہرے سے تو بڑی کائیاں معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایک آدھ ملاقات میں ہی صحیح رائے قائم کرنا مشکل ہی تو ہے۔ وہ ان ہی خیالات میں ڈوبی ہوئی جب گھر میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا فرزانہ اپنے بستر پر نڈھال پڑی سو رہی ہے۔

بالآخر ایک دن اس نے فرزانہ سے پوچھ ہی لیا۔ کیا ملتانی تجھ سے انسٹی ٹیوٹ ملنے آتے ہیں؟"

"یہ سچ ہے کہ ملتانی کے طفیل مجھے یہ ملازمت ملی۔ یہ سروس بھی میں نے

آپ کے کہنے پر قبول کی ہے ورنہ مجھے اس کی صورت سے نفرت ہے۔ مجھے تو وہ خاصا فراڈ آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

فرزانہ کے اس جواب کے بعد اس کے دل میں شک اور شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی شاید اس لیے اس نے نفرت کے جذبے کی تہہ تک پہنچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

شاید وہ یہ بات بھول گئی کہ راکھ کے ڈھیر کے نیچے دبی ہوئی کئی چنگاریاں بھی ہوتی ہیں جو کسی وقت بھی ہوا کے ذرا سے جھونکے کے ساتھ شعلوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔

عجیب وغریب بات تو یہ تھی کہ پہلی ہی نظر میں ملتانی نے فرزانہ کو پسند کر لیا تھا اور فرزانہ بھی اس کی شخصیت سے مرعوب ہو چکی تھی۔ فرزانہ کی محبت کا روپ دنیا کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ وہ یہ جاننے کے باوجود کہ ملتانی اس کے باپ کے ملنے والوں میں سے ہے۔ وہ اسے دل دے بیٹھی تھی۔

اُسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ پچھلی رات شدّتِ جذبات میں ملتانی کی باہوں میں آ گئی تھی۔ چاہت کی گرد شبنمی بوسوں سے ہمکنار ہو گئی تھی۔

اور ملتانی والہانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"تم میری ہو فرزانہ۔ میں تمھیں پا کر کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔"

جواب میں وہ چپ سی رہ گئی تھی۔ صرف اُس کی انگلیاں ملتانی کے چوڑے چکلے سینے پر چلنے لگی تھیں اور ملتانی اُس پر جھکا ہوا اس کے رخساروں کو پیار سے تھپتھپا رہا تھا۔

دوسرے دن فرزانہ گھر میں ہی پڑی رہی۔ جب ہاجرہ نے پوچھا کیا آج وہ

انسٹی ٹیوٹ نہیں جائے گی تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

باہر دروازے پر کوئی پکار رہا تھا۔

"کیا بھئی، ہم آ سکتے ہیں۔"

اُس کے کان اس آواز سے آشنا تھے۔ اُسے یوں لگا جیسے یہ آواز جھرنے سے پھوٹ رہی ہو۔

اُس نے باہر جا کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ ملتانی آخر کہاں چلا گیا۔؟ دو مرتبہ ہی تو اس نے آواز دی تھی۔ اس کی اس بے نیازی پر اُسے کوفت سی ہونے لگی تھی۔ کچھ دیر تو اُسے توقف کرنا چاہیے تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے غلط سُنا ہو اور وہ آیا ہی نہ ہو۔ نہیں نہیں اُس کے کان دھوکہ نہیں کھا سکتے۔ وہ ضرور آیا تھا۔ اُس نے آواز بھی دی تھی۔ اس آواز کو وہ بھلا کیسے بھلا سکتی ہے۔

پھر وہ برآمدہ پار کرتے ہوئے فرزانہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ فرزانہ کی نگاہیں کتاب کا احاطہ کیے ہوئے تھیں وہ کچھ پڑھ رہی تھی۔

"فرزانہ! ابھی ابھی تم نے باہر کسی کی آواز تو نہیں سُنی؟"

"ہاں سُنی تو تھی"۔

"کون تھا وہ؟"

"میں کیا جانوں؟"

"کہیں وہ ملتانی تو نہیں تھا؟"

"شاید وہی ہو" فرزانہ نے بیزار لہجے میں کہا۔

وہ گہری سوچ میں ڈوب کر رہ گئی۔

"کیا بھئی ہم آسکتے ہیں، کیا ہم آسکتے ہیں؟" در و دیوار سے یہ آواز اُسے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ باہر کھڑے کھڑے دور ہی دور سے آواز کیوں لگاتا ہے۔ وہ بغیر کچھ کہے گھر میں کیوں نہیں چلا آتا اس نے اسے تنگ کرنے کی کیوں ٹھان رکھی ہے ــــ ؟

پھر اُس کے اندر کی عورت نے کہا ــــ وہ بیاہتا ہے ایک جواں سال لڑکی کی ماں ہے، اسے اس عمر میں ایسی باتیں تو نہیں سوچنا چاہیے۔ اسد صاحب اس کے شوہر ہیں۔ "جیون ساتھی"

پھر وہ منھ ہی منھ میں بڑبڑائی۔

اِس نے برسوں پہلے اس زندگی سے طوعاً کرہاً سمجھوتا کر لیا تھا۔ وہ کسی وقت بھی پکار پکار کر کہہ سکتی تھی کہ اُسے اسد سے محبت نہیں ہے ــــ لیکن کبھی اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔

ملتانی سے ملنے سے پہلے کبھی اس کے ذہن میں یہ بات پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آج اُس کی زندگی کے سامنے ایک نیا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مد جوں کی یہ طلاطم خیزی آنے والے ایک بڑے اور ہولناک طوفان کا پیش خیمہ تھی اور وہ اس وقت کی منتظر تھی جب وہ اپنے آپ کو اپنی شخصیت کے ہر بن مو کو اس طوفان کی آغوش میں سونپ دے۔

لیکن وہ ہوا کے اِس رُخ کو پوری طرح سمجھ نہیں سکی تھی جو اُس کے پہلو سے ہوتا ہوا فرزانہ پر جا کر ختم ہوتا تھا۔

دوسرے دن جب فرزانہ انسٹی ٹیوٹ چلی گئی تو وہ بھرے گھر میں خود کو تنہا

محسوس کرنے لگی اس کی چھٹی حِس کہہ رہی تھی کہ آج ملتانی ضرور آئے گا۔ ہر آہٹ
پر اسے ملتانی کے آنے کا گمان گزرتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے شام ہو گئی ——؛

اور پھر رات کی سیاہی چاروں طرف پھیل گئی ——

جب گھڑی نے رات کے ۹ بجائے تو وہ اٹھ کھڑی ہوی۔ میز کی دراز سے
تالا نکالا اور باہر کے دروازے پر تالا لگا دیا۔

ایک لمحے کے لیئے اسے احساس ہوا —— اگر اس دوران فرزانہ گھر پر تالا پڑا
ہوا دیکھ لے تو پریشان ہو جائے گی۔

نہیں نہیں اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے ——
کچھ دیر اور اس کا انتظار کرنا چاہیئے ——

اس نے تالا کھول دیا اور پھاٹک ہی سے قریب اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔

آدھ گھنٹہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا —— لیکن فرزانہ نہیں آئی ——

اُسے آٹھ بجے گھر میں رہنا چاہیئے تھا۔

آخر وہ کہاں مر گئی! ؟

وہ غصّے سے پیچ و تاب کھاتی ہوی پھاٹک کے باہر نکل آئی۔ تالے
میں چابی گھمائی ایک بار اُسے اچھی طرح دیکھا اور چل پڑی۔

اب اُس کے قدم کے کے " انسٹی ٹیوٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

وہ اپنا سارا غصّہ فرزانہ پر نکالنا چاہتی تھی۔ کوفت اور غصّے کے عالم میں
اُسے یہ بات بھی یاد نہ رہی کہ "کے کے" انسٹی ٹیوٹ کا فاصلہ اس کے گھر سے بہت

زیادہ ہے۔

جیسے تیسے جب وہ انسٹی ٹیوٹ پہنچی تو وہاں گوہر سلطانہ آرام کرسی پر بیٹھی جھولا جھول رہی تھی۔ اس کے منہ میں پان تھا۔ وہ پان چباتے ہوئے بڑی بھیانک لگ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی محراب سے سرخ سرخ دانت بڑے بھدے اور کریہہ دکھائی دے رہے تھے۔

کیا فرزانہ آج انسٹی ٹیوٹ آئی تھی؟ اس نے بظاہر غصّے کو پیتے ہوئے پوچھا۔ لیکن اس کے چہرے سے یہ بات صاف عیاں ہو رہی تھی کہ آج اس کا موڈ ضرورت سے زیادہ بگڑا ہوا تھا۔

"ہاں آئی تھی اور ملتانی کے ساتھ چلی بھی گئی۔ شاید وہ پھر یہاں نہ آئے! بعض لوگ نئی زندگی کے زینے پر چڑھنے کی خواہش ہی میں سیڑھیاں گنتے رہ جاتے ہیں ـــــ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو چپ چاپ ایک ہی جست میں اسے پار کر جاتے ہیں ـــــ فرزانہ بھی ان ہی میں سے ایک تھی" ـــــ گوہر سلطانہ نے اطمینان سے پان کی پیک کو اگالدان کی نذر کرتے ہوئے کہا۔

وہ یہ سن کر چکرا سی گئی ـــــ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا منڈلا رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ گر پڑتی لیکن گوہر سلطانہ نے اسے سنبھال لیا۔

"گھبراؤ نہیں میم صاحب ـــ زندگی میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ فرزانہ جاتے جاتے تمہارے لیے یہاں جگہ چھوڑ گئی ہے ـــ تم چاہو تو اس کی جگہ پر کر سکتی ہو۔"

اس نے غیض و غضب کے عالم میں اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا۔ لیکن وہ ہنستی رہی ـــ ہی ہی ـــ اس کے میلے سرخ اور

کر بھیہ دانت اس کا منھ چڑاتے رہے۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔
وہ تیزی سے چبوترے پر آئی۔ ٹیکسی لی اور گھر آ گئی۔

اب وہ اپنے بستر پر اوندھے منھ پڑی سسکیاں لے رہی تھی ——

باہر وہی مانوس آواز اُس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی ——

"ارے بھئی کیا ہم آسکتے ہیں؟"

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے پھاٹک تک آئی اور اچانک گر پڑی۔

باہر دُور دور تک کوئی نہ تھا!!!

اُس کا گھر

شام کو جب وہ گھر لوٹا تو دروازے کے قریب ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس کے نام کی تختی کی جگہ کوئی آدمی اپنی نیم پلیٹ لگا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ملگجی ہتوڑی تھی اور دوسرے ہاتھ میں باریک کیلیں

وہ تھوڑی دیر یوں ہی کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ اُسے احساس ہوا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ بھلا جاگتے میں کسی نے خواب دیکھا ہے؟

اُسے مزید حیرانی اس وقت ہوی جب اس نے پلٹ کر اپنے نام کی تختی لگانے والے آدمی کے چہرے کو دیکھا۔ اُس کا چہرہ ہو بہو اُس کے چہرے سے ملتا جلتا تھا۔ وہ دم بخود سا ہو کر رہ گیا۔

"تمہیں پتہ ہے یہ کس کا گھر ہے؟"

"ہاں پتہ ہے تب ہی تو میں نے ...... وہ ایک لمحے کے لیے رُکا۔ اور قدرے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں وہ تختی تھما دی جس میں اس کا نام درج تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھا مگر وہ ہر طرح سے مطمئن دکھائی دے

رہا تھا۔

" دراصل یہ کام مجھے بہت پہلے کرنا چاہیئے تھا۔ کرتا بھی کیسے میں یہاں تھا ہی کہاں"۔

اُس کی اس ڈھٹائی پر وہ مزید حیران ہوا۔ لوگوں کو آواز دی کہ دیکھو لوگو۔ اِس پاجی نے میرے گھر پر اپنے نام کی تختی لگادی ہے۔ اس سے کہہ دو کہ یہ اس کا گھر نہیں ہے"۔

مگر لوگ یا گ تماشا دیکھتے رہے۔ کسی نے آگے بڑھ کر یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ کیا زیادتی ہے۔ پھر قدرے دھند چھٹی تو لوگوں میں کھُسر پھُسر شروع ہوگئی۔ "اِس کا چہرہ تو ....؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"

کیا وہ ——— وہ نہیں ہے جو ہے۔ یا وہ جو ہے اس کا کوئی وجود نہیں ہے وہ شدید اُلجھنوں وسوسوں کے درمیان ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے۔ بالآخر وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور اپنے گھروں کی حفاظت میں جُٹ گئے۔ کچھ لوگ دم بخود تھے کہ ان کے ناموں کی تختیوں کو کسی نے الٹ دیا تھا۔ جب کہ وہ ابھی ابھی گھر سے نکلے تھے۔

مگر وہ اجنبی ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ —— میں نے اپنے نام کی تختی لگادی ہے، میں کسی وقت بھی تمہارے گھر ——— وہ منھ ہی منھ میں بڑبڑاتا ہوا آگے کی اور چل پڑا۔

اس نے اندر کمرے میں جاکر اپنی بیوی کو جگایا۔ "میں ایک قیامت سے گزر کر

یہاں آیا ہوں ــــ اور تم بے سُدھ سو رہی ہو۔

"آخر ہوا کیا ــــ؟"

"میرے نام کی تختی ــــ؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"نام کی تختی۔؟ کیا ہوا اُسے۔"

اس کی جگہ ــــ کسی نے اپنے نام کی تختی لگا دی۔ اُس کا اصرار ہے کہ یہ گھر اُسی کا ہے اور وہ کسی وقت بھی یہاں آسکتا ہے؟

"کیا کہہ رہے ہو؟"

ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔

مگر اُس کا چہرہ ــــ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"یقیناً تمہیں کچھ ہو گیا ہے۔ میں بڑے پیر کے ہاں جاتی ہوں کہ وہ خُدا تعالیٰ سے ...."

"مگر یہ دروازہ کون پیٹ رہا ہے۔

خُدا کے لیے دروازہ مت کھولو۔"

اس کی بیوی نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا محلے کے چند شریر بچے آپس میں اُلجھ رہے تھے۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں، اگر کسی غنڈہ نے اپنے نام کی تختی گھر پر لگا بھی دی تو کیا یہ گھر اس کا ہو جائے گا؟"

"مگر اس کا چہرہ؟"

چہرہ ــــ؟

"ہاں- وہ مجھ سے ہو بہو ملتا جلتا تھا-"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

یہی تو گڑبڑ ہے- ہو سکتا ہے، میں وہ نہیں ہوں جو وہ ہے' اور جو وہ ہے........

"کیا بک بک لگا رکھی ہے؟"

قبل اس کے وہ آگے سلسلہ کلام جاری رکھتی- دفعتاً محلے میں ایک شور سا بلند ہوا-

"ہم یہاں آنے والے کا گلا گھونٹ دیں گے- اسے کیا حق پہنچتا کہ وہ ہمارے ناموں کی تختیاں اُلٹ دے- ہم اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے-"

"اچھا تو وہ ان کے گھر بھی گیا تھا، مگر جب میں نے اُن سے مدد مانگی تو وہ سر جھکائے اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے- اس کا دل چاہا کہ اوپری دل ہی سے سہی باہر نکل کر اس ہجوم میں شامل ہو جائے- لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے گھر کی کھڑکی بند کر دی-

اب وہ بڑی بے چینی سے گھر کے آنگن میں ٹہل رہا تھا- اضطراری کیفیت کے اس عالم میں وہ یہ طے بھی نہ کر سکا کہ اُسے جانا چاہیئے بھی یا نہیں-

ہاں- نہیں ---- ہاں- کی آوازوں کے زیر و بم میں وہ کھو سا گیا-

وہ باہر کب نکلا اُسے کچھ یاد نہ تھا- مجمع بدستور شور مچا رہا تھا- "اب اگر وہ یہاں آئے تو ہم اس کا گلا گھونٹ دیں گے- اس کا چہرہ ہمارے ذہن میں ہے- ہو سکتا ہے یہ لوگ غلط فہمی میں کبھی .... وہ اس بھیانک

تصوّر ہی سے کانپ کانپ گیا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔
ہوسکتا ہے یہ محلے کے چند بچّوں کی شرارت ہو۔

یہ ہمارا اپنا واہمہ ——"

"کیا کہہ رہے ہو؟ کل ہم نے جو کچھ دیکھا۔ کیا وہ واہمہ تھا؟
یہ جو تمہارے گھر اس کے نام کی تختی لگی ہوئی ہے۔ کیا یہ بھی واہمہ ہے؟"

"نہیں —— مگر پھر بھی۔

"مگر آپ نے اس کے نام کی تختی ابھی تک کیوں نہیں نکالی" کسی نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔

"میں نے نہیں نکالی تو تم ہی نکال دو۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے"۔
سوال کرنے والے کے قدم رک سے گئے۔ اب وہ گومگو عالم میں کھڑا تھا۔

"وہ کل آنے والا ہے"۔
"کون کل آنے والا ہے"۔
" وہی جس نے......

"تمہیں کیسے معلوم۔؟"
"اس نے مجھ سے یہی کچھ کہا تھا"۔
کچھ اور بھی کہا تھا اُس نے۔
نہیں ——
تو ساتھیو! آنے والے کل کے دن ہمیں ہر طرح چوکس رہنا چاہیئے۔ کیا عجب کہ وہ ——

اُسے پہلے آنے تو دو۔

مگر آج کل تو کل میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی۔

غلطی ہماری ہے کہ ہمیں اسی دن۔ اُسے مزہ چکھانا چاہیئے تھا۔

جمعہ گزر گئی سو گزر گئی، اب آنے والے کل کا انتظار کرو۔

"کل کس نے دیکھا ہے؟"

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ محلے کا ایک جانا پہچانا لڑکا بھاگا بھاگا آیا۔

اُسے یوں آتے دیکھ کر لوگوں نے کہا۔ ضرور کوئی بات ہے۔ یقیناً وہ مردود آیا ہوگا۔ مگر وہ تو کل آنے والا تھا۔

لیکن آج کو کل کا روپ دھارنے میں کیا دیر لگتی ہے۔

مگر وہ لڑکا بغیر کچھ کہے اُلٹے پاؤں کیوں واپس ہو گیا۔

کیوں ——— ؟

آخر کیوں۔

پھر جب لوگ باگ وسوسوں کا پُل پار کر چکے تو اس نے بھی اپنے گھر کی راہ لی۔

دروازے کے قریب پہنچ کر جب اُس نے اپنے نام کی تختی دیکھی تو اسے حیرانی ہوئی۔ اور یہ حیرانی لمحہ بڑھتی گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا بستر پر جا گرا۔ اُسے لگا جیسے کوئی ہولے ہولے اس کے دروازے پر دستک دے رہا ہو۔

مگر اگلی صبح جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو اس کے ذہن کی سلیٹ سے خود اس کا اپنا نام غائب تھا۔!!

پلیٹر

وہ تازہ اخبار کی سُرخیوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک کسی نے کال بل پر آہستہ سے اُنگلی رکھی۔ اُسے گمان گزرا کہ شاید کوئی اُس سے ملنے آیا ہو۔ اُس نے دروازے سے باہر آکر دیکھا۔

ایک اَدھیڑ عمر کا کالا بھجنگ سا آدمی اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ اپنی سیاہ رنگت کے باوجود وہ اُسے بڑا پیارا لگا۔

"معاف کرنا۔ میں نے تجھے بے وقت زحمت دی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ........

وہ آگے کچھ کہتے کہتے رُک سا گیا جیسے وہ آپ ہی آپ شرما رہا ہو۔ گو اُس کا یہ بے تکلّفانہ انداز اُسے کھل رہا تھا لیکن اُس کی بزرگی کو دیکھتے ہوئے اُس نے نرم لہجے میں کہا

"کچھ تو کہیئے ـــــ میں نے ابھی پورا اخبار نہیں پڑھا ہے۔ صرف سُرخیاں

ہی دیکھی ہیں۔"

"لگتا ہے تو بہت جلدی میں ہے۔"

"کچھ بھی سمجھئے مگر خدارا کچھ تو کہئیے۔"

"تو سن۔ تو نے میرے پیٹر کو پکڑ رکھا ہے۔"

"میں نے اور آپ کے پیٹر کو ——؟"

"ہاں ——"

"وہ مجھے یہاں سے صاف نظر آرہا ہے۔"

اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں مگر پیٹر اُسے نظر نہ آیا۔ مجھے تو وہ کہیں بھی نظر نہیں آرہا ہے۔ اگر آپ کی آنکھیں اتنی روشن ہوں تو اُسے بلا تکلّف پکڑ لے جائیے اور آئندہ احتیاط برتئیے کہ وہ دوبارہ کبھی یہاں نہ آئے۔ یہ کہہ کر اُس نے ٹیبل پر دھرے اخبار کو یُوں اٹھایا جیسے وہ اس ناگہانی آفت سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو۔

" اخبار میں کیا دھرا ہے۔ وہی قتل و غارت گری۔ اغوا۔ زنا۔ چوری اور ڈاکہ زنی ——"

"کچھ بھی ہو۔ مجھے اِن باتوں سے کچھ مطلب نہیں۔ اگر آپ کا خیالی کُتّا یہاں ہو بھی تو فوری اُسے لے جائیے اور میرا قیمتی وقت برباد نہ کیجئے۔

بجائے اس کے کہ وہ اپنے لاڈلے پیٹر کو یہاں تلاش کرتا۔ وہ ڈھیٹ بنا یوں ہی کھڑا رہا۔ اور اسے ٹُکر ٹُکر دیکھنے لگا۔

اُس نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا سحر تھا۔ جیسے وہ آدمی نہ ہو کوئی جادوگر ہو۔ وہ ایک لمحے کے لیے لڑکھڑا سا گیا۔

"آخر ڈر گیا نا ـــــ" اس نے فاتحانہ انداز میں اس طرح کہا کہ اس پر ایک چپ سی طاری ہو گئی۔

اور اس کا وہ تند و ترش لہجہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اُس نے بمشکل تمام اپنے حواس کو یکجا کرتے ہوئے۔ صرف اتنا کہا۔ "آپ میرے گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں۔"

اس کے منہ سے نکلے ہوئے اس گھبراہٹ بھرے جملے کو سن کر اس نے ایک زوردار ہذیانی قہقہہ لگایا۔ اُسے لگا جیسے وہ اس کی بزدلی کا مذاق اُڑا رہا ہو۔ پھر وہ ایک فاتح کی طرح صوفے پر آکر دراز ہو گیا۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اُس نے زبان کھولی۔

"ابھی ابھی وہ مجھے نظر آرہا تھا۔ اسے تُو نے کہاں غائب کر دیا۔"

"میں نے ـــــ؟"

"تو پھر کیا میں نے غائب کر دیا ہے۔ بہت دنوں سے غائب ہے نا۔ اس لیے شاید منہ چھپا رہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔"

"مگر تیرا یہ بیمار صوفہ تو مجھے کاٹ رہا ہے۔"

"اس طرف کرسی دھری ہے۔ شاید وہ آپ کو آرام پہنچائے۔"

"آرام تو مجھے بیٹر ہی پہنچائے گا۔ جسے میں لینے یہاں آیا ہوں۔ مگر وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا۔ تیرے گھر کا راستہ تو صرف یہی ایک ہے نا ـــــ

"جی ہاں یہی ایک راستہ ہے۔" اب وہ ہولے ہولے خوف کے ڈر سے

سے نکل رہا تھا۔

کبھی کبھی ایک راستہ بھی کئی راستوں کے لیے حصار بن جاتا ہے۔ یہاں ایسی کوئی بات تو نہیں ہے نا۔۔۔"

"شاید نہ ہو"

شاید سے تیری کیا مراد ہے؟ کیا واقعی اس گھر میں کوئی چور دروازہ بھی ہے جہاں سے وہ پھلانگ کر بھاگ جائے۔

"یہی ایک دروازہ ہے جسے آپ دیکھ رہے ہیں۔ ویسے آپ اپنی تشفی کے لیے اس گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں"

"وہ تو میں لوں گا ہی۔۔۔ میں پیٹر کے بغیر زیادہ دن جی بھی نہیں سکتا۔ اس نامعقول نے مجھے بہت ستایا ہے۔ اب جب کہ وہ میرے قبضے میں آچکا ہے۔ میں اسے بہر طور چھوڑنا نہیں چاہتا" یہ کہہ کر وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی پیٹھ کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"بیٹے تو نے مجھے بہت ستایا ہے۔ اب آ۔۔۔ اپنے گھر لوٹ چلیں۔۔!"

▲▲

مُصنّف کی دیگر تصانیف:

۱۔ سائے کا سفر ۱۹۶۹ء

۲۔ تیسرا مجسّمہ ۱۹۷۳ء

۳۔ رات والا اجنبی ۱۹۷۷ء

۴۔ کوہِ ندا ۱۹۷۹ء

۵۔ خاکے ۱۹۸۵ء